یا خدا

قدرت اللہ شہاب



قدرت اللہ شہابؒ

یاخُدا

ترتیب

اس کہانی کی کہانی

جو قدرت اللہ شہاب نے خاص اس ایڈیشن کے لیے لکھی ہے

ربُّ المشرقین

تری دنیا میں میں محکوم و مجبور

ربُّ المغربین

مری دنیا میں تیری پادشاہی

ربُّ العالمین

مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

مہاجرین کے نام

جو ابھی بقیدِ حیات ہیں
لیکن ہم ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے

اِس کہانی کی کہانی

ستمبر ۱۹۴۷ء کا مہینہ تھا اور ہندوستان سے لٹ پٹ کر آنے والے مجروح قافلوں کا تانتا بندھا ہوا تھا جو پہلے آ گئے تھے وہ بعد میں آنے والوں کے انتظار میں ہزاروں کی تعداد میں واگہ بارڈر پر کھڑے رہتے تھے۔ کسی کی ماں، کسی کا باپ، کسی کا بھائی اور کسی کا بیٹا، واگہ پار کی بے کراں پہنائی میں گم تھا۔ اکثر کا یہ انتظار موہوم ثابت ہوتا۔ بعضوں کو فقط اپنے پیاروں کے جانگزا انجام کی خبر ملتی۔ کچھ خوش قسمت ایسے بھی تھے کہ خستہ و خراب عزیزوں کو پا لیتے تھے لیکن کم۔ مایوس و نامراد منتظرین کے چہروں کی خستگی دیکھنے کی ہوتی تھی۔

میں بھی انتظار کرنے والوں میں تھا۔ اپنے چچا زاد بھائی نعمت اللہ شہاب کا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ نعمت اللہ میرا چچا زاد بھائی

ہی نہ تھا، لنگوٹیا دوست بھی تھا جس کے ساتھ چکوڑہ کے سکول میں میں نے کیا کیا دھومیں نہ مچائی تھیں۔ اب وہ ایک دیہاتی سکول میں انگریزی کا ماسٹر تھا اور اپنی سبک زین نقشے والی بیوی کے ہمراہ کہیں بچھڑ کے رہ گیا تھا۔ وہ زندہ تھا یا کشتوں میں شامل ہو گیا تھا یا کسی کیمپ میں پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا، مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ بہرحال مجھے اس کا انتظار تھا۔ یہ آس کا رشتہ بھی خوب ہے۔ ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتا۔ آخر وہ ایک روز آیا، لیکن میں اسے نہ پہچانا۔ لوگوں کو متجسس دیکھتا ہوا میں اس کے پاس سے دو تین بار گزر گیا، آخر اس نے خود مجھے 'قدرت' کہہ کے آواز دی۔

یہ نعمت اللہ کوئی اور تھا اس جنس نکھ البیلے جوان کی جگہ ایک صدیوں کا ماندہ ہڈیوں کا ڈھانچ لباس خون آلود، چہرہ غبار آلود — میں نے پوچھا — "نعمت بھائی کہاں ہے؟" وہ رو دیا اور اپنے پاس بیٹھی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ اس عورت کا چہرہ داغ داغ تھا۔ جیسے چہرے کی کھال جیسے جلتی ہوئی آہنی سلاخوں سے داغ دی گئی ہو۔ ہوا بھی یہی تھا، اس ہمت اور غیرت والی خاتون نے اپنا چہرہ خود داغا تھا تاکہ کیمپ میں آنے والے شکاریوں کی نظر ہوس سے محفوظ رہے۔ وہ چہرہ نہ داغتی تو اس وقت دانگ کے اس پار نہ ہوتی اور اب تک غالباً اس کا سارا جسم داغ چکا ہوتا — نعمت اللہ کا یہ عالم اس طرح ہوا کہ چند سورماؤں نے کیمپ کے کنوئیں میں نیلا تھوتھا گھول دیا تھا۔ بعضے اس آبحیات کو پی کر کیمپوں میں زندہ

جاوید ہو گئے، نعمت اللہ ان میں سے تھا جن کی آنتیں اس مشروب سے کٹ کر رہ گئیں — نعمت اللہ اسی روز — اس ارض موعود میں پہنچنے کے چند گھنٹے بعد بار حیات اتار کر سبکسار ہو گیا۔ وہ عفیفہ' اس کی بیوی تیسرے روز چل بسی اور میں جو تین دنوں سے منتظر تھا۔ خالی ہاتھ کراچی واپس آ گیا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں لارنس روڈ کے ایک بنگلے میں رہتا تھا رات بھر اس کی روشنیاں جلتی رہیں اور رات بھر میں بیٹھا یہ کہانی لکھتا رہا۔ نعمت اللہ کی کہانی — اپنے گاؤں چکوڑہ کی کہانی۔ اپنے گاؤں کے تاؤ علی بخش کی بیٹی دلشاد کی کہانی۔ کیمپوں کا حال جو میں نے لکھا ہے، لاہور میں دیکھا۔ مہاجر بہنوں کو شکار کرنے والے بہت سے بھائی جن کے چہرے یا خدا میں نظر آئیں گے۔ مولوی خدام خلق' قوم کے لیڈر اور سیاست دان، سبھی اصل کردار ہیں۔ میں نے ان کے نام نہیں لکھے۔ ان میں ایک صاحب کو تو خدا نے وزیر مملکت بھی بنایا۔ خدا جسے چاہے ہر عزت دے دے اس کی مصلحتیں وہی جانے۔

اس کہانی کا انجام بھی میرے ذہن نے نہیں سوچا۔ اسے میری گنہگار آنکھوں نے کراچی کے عیدگاہ میدان میں دیکھا جہاں بے خانماؤں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ یہیں دلشاد، یا اس نام کی عورتیں مجھے کھوڑے سے تلتی، بچتی نظر آئیں۔ ساتھ والی سے کہا "بہن ذرا میرے بچے کا دھیان رکھنا، میں بیمن سے آؤں"۔ اور کسی کے ساتھ بیٹن لینے چل دیں۔ یہ کھوڑے برسوں تک جاتے رہے اور بکتے رہے، شاید اب بھی ان

میں سے باقی ہوں۔ یہ بچے اب تیرہ چودہ برس کے ہونہار قلی، مزدور یا بھک منگے اس ارضِ موعود کے شہریوں میں شامل ہیں۔

۱۹۴۷ء ابھی ختم نہیں ہوا۔

اس کہانی کی کہانی بھی ختم نہیں ہوئی۔

کراچی کے بعد میرا تقرر لاہور میں محکمہ صنعت کے ڈائرکٹر کے طور پر ہوا۔ ایک روز ڈاک میں ایک پھٹا پرانا میلا لفافہ مجھے ملا۔ سواد تحریر قطعی طور پر اجنبی تھا۔ میں نے کھولا، یہ ایک لڑکی کی داستان تھی جو کہ وہ تنہا بے یار و مددگار اچھرہ کے قریب مہاجرین کی جھونپڑیوں میں رہتی تھی۔ اس نے لکھا کہ میرا جسم داغا گیا لیکن میں اس پار پہنچ گئی۔ یہ دھرتی میرے لیے فردوس کی سرزمین اور یہاں کا ہر مسلمان مجھے شفیق بھائی دکھائی دیتا تھا لیکن یہ بھائی ہوسناک شکاری نکلے۔ انھوں نے میری جو خاطر و مدارات کی ہے، اس کے طفیل اب میں تپ دق کی مریض ہوں اور میرے بہت دن باقی نہیں۔ تھوڑا پڑھی لکھی ہوں۔ "یا خدا" کہیں سے مل گئی تھی میں نے پڑھی۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ میں دلشاد بن کر بھی دلشاد نہ بن سکی۔ میں ان مجبوروں میں سے ہوں جو جنسی خوشی کچوٹے نہیں کل سکتیں۔ بہن نہیں لا سکتیں اور اس پاک سرزمین میں سینکڑوں شاید ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔

میرے پاس ایک لمبی سی شورلیٹ کار تھی۔ ان دنوں اس کی قیمت سستی اور

شان زیادہ تھی..... اسے میں نے ان جھونپڑیوں سے دور سڑک پر چھوڑا، اور پوچھتا پچھاتا ڈھونڈتا ایک ٹاٹ کی جھگی میں پہنچا۔ وہاں ایک ویران آنکھوں والی میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس بیٹھی تھی۔ لڑکی کیا تھی، راکھ کا ڈھیر یا چوب خشک جو ـــ لگ کے آگ بجھنے کو۔ وہاں روانہ ہوا۔

راستے میں کوئی زیادہ باتیں نہیں ہوئیں۔ ایک بار اس لڑکی نے لمبی آہ بھری اور کہا شاہ صاحب۔ میں اس سے زیادہ قیمتی اور چمکیلی کاروں میں سوار ہو چکی ہوں جن دنوں یہاں کیمپ میں تھی اور انھی کاروں میں واپس کیمپ پہنچ جاتی تھی۔

اس لڑکی کا علاج ہو گیا۔ اسے ایک چھوٹا سا مکان بھی مل گیا اور تھوڑا بہت روزی کا وسیلہ بھی ہو گیا اور میرے ذہن سے یہ واقعہ نکل گیا اور میں ایک بار پھر کراچی میں ایک نوکری پر چلا گیا۔

ایک روز میرے چپڑاسی نے ایک کاغذ کا پرزہ لا کر دیا کہ ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک برقعہ پوش خاتون بھی ہیں۔ نام ان صاحب کا میرے لیے اجنبی تھا۔ میں نے انھیں اندر بلایا اور کہا معاف کیجیے میں آپ کو پہچانا نہیں۔ ان صاحب نے مسکرا کر اس برقعہ پوش خاتون کی طرف اشارہ کیا جس نے اب نقاب الٹ دیا تھا۔ یہ ایک چمپئی رنگ کی شعلہ رخسار خاتون تھی۔ اس نے کہا "میں اچھرہ کی جھگی میں رہنے والی وہ نار ہوں جو دلشاد نہ بن سکی۔" یہ میرے میاں ہیں۔ اور

میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں کیونکہ میں پھر زندوں میں ہوں۔

رات کو یہ لوگ میرے ہاں کھانے پر آئے۔ دوسرے روز پھر دس کروڑ آبادی میں گم ہو گئے اور اس پر کئی سال گزر گئے۔

پچھلے دنوں ــــ ابھی چند ماہ پہلے کی بات ہے ــ میں صدر پاکستان کے ہمراہ مشرق وسطیٰ کے دورے کی ایک منزل دہران میں اترا۔ یہ تیل کا مرکز ہے اور امریکہ کا ایک اہم فوجی اڈہ۔ یہاں حسب رسم ہمارا تعارف مقامی عہدہ داروں اور معززین سے کرایا گیا۔ انھی میں ایک صاحب پاکستانی تھے، ریشمی صافہ باندھے ہوئے۔ انھوں نے کہا شہاب صاحب آپ مجھے پہچانے؟ میں نادم ہوا تو بولے میں آپ سے کراچی میں ملا تھا اور یہ میری بیوی ہیں۔ انھیں آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔

یہ وہی خاتون تھی لیکن اب پہچانی نہیں جاتی تھی۔ چہرے پر جوانی کے علاوہ خوشحالی کی آسودگی اور طمانیت کا نور تھا۔ اس نے بتایا کہ اب ہمارا تین سال کا ایک بچہ بھی ہے۔

اس کتاب کے لکھے جانے کے چودہ سال بعد مجھے یقین ہو گیا کہ موت کے بعد تو نہیں البتہ اسی ارضی زندگی میں آواگون کا چکر ضرور چلتا ہے۔ زندہ انسان آخری موت سے پہلے کئی مرتبہ مرتا اور کئی بار نیا جنم لیتا ہے۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را　　　ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

جب میں دلشاد کی زندگی کو مخالفانہ تنقید دل کے پیمانے کے ساتھ تولتا ہوں جو اس کتاب

پڑھیں تو مجھے یہی زندگی جاری نظر آتی ہے۔ بہت لوگ اس کتاب کے چھپنے پر مجھ سے خوش ہوئے اور مجھے بہت سے طعن سننے پڑے لیکن اس روشن بشاش اور صبیح چہرے کے مقابلے میں جو مجھے دہران میں نظر آیا ان کی کیا حقیقت ہے۔ اگرچہ اس نتیجے کو بھی میں ضمنی ہی سمجھتا ہوں۔ مجھے تو فقط اپنے یار جانی نعمت اللہ اور اس کی [illegible] بیوی کی کہانی لکھنی تھی جن کے انتظار میں میں ہفتوں واہگہ کے بارڈر پر کھڑا رہا۔ اور جن کی تلاش میں میں نے وہ سب کچھ دیکھا جو ہزار کوشش کے باوجود بھی میرا قلم پوری طرح لکھنے سے قاصر رہا۔

قدرت اللہ شہاب

یکم ستمبر ۱۹۶۱ء

ربُّ المشرقَین

ترى دنیا میں مَیں محکوم و مجبُور

"اُس طرف کیا تکتی ہے سالی؟ تیرا کوئی خصم ہے اُدھر؟" ——
امریک سنگھ نے کرپان کی نوک سے دلشاد کی پسلیوں کو گدگدایا، اور بایاں گال کھینچ کر اُس کا منہ پچھم سے پورب کی طرف گھما دیا۔

دلشاد مسکرا دی۔ یہ مسکراہٹ اس کا خاصہ بن گئی تھی۔ بچپن میں اس کا کامیاب ترین ہتھیار اس کا رونا تھا۔ ایک ذرا سی ریں ریں، رال ٹپکا کر وہ ماں کے سینے میں چھپاتے ہوئے دودھ سے لے کر الماری میں رکھی ہوئی برنی تک ہر چیز کو حاصل کر لیا کرتی تھی۔ اب جوانی نے اس کی مسکراہٹ میں اثر پیدا کر دیا تھا۔ اس نئے جادو کا علم اس کو اس وقت ہوا جب اس کی

ایک مسکراہٹ پر نثار ہو کر رحیم خان نے قسم کھائی تھی کہ اگر چاند یا سورج یا تارے بھی اُسے اٹھانے جائیں تو وہ ارض و سما کی وسعتیں پھاند کر اسے چھین لائے گا۔

رحیم خان جھوٹا تھا۔ مکار کہیں کا۔ آسمانوں کی بات تو دُور کی بات تھی وہ تو اسے زمین ہی پر کھو بیٹھا۔ دلشاد نظر بچا بچا کر قبلہ رُو ہو بیٹھتی تھی اور خیالوں ہی خیال میں اپنی جبیں کو اس آستانے پر جھکا دیا کرتی تھی، جس کے دامن میں رحمتوں اور نعمتوں کی ایک بے کراں دنیا پوشیدہ بتائی جاتی تھی۔ مغرب کی طرف کعبہ تھا۔ کعبہ اللہ میاں کا اپنا گھر تھا۔ اس گھر کا تصور دلشاد کے دل میں عقیدت اور امید کا ایک تابناک چراغ روشن کر دیتا تھا۔ لیکن امریک سنگھ کو پچھم سے بے حد چڑ تھی۔ یوں بھی سکھوں کی اس بستی میں چند رواج بڑے ٹیڑھے تھے، ایک کریلا دوسرے نیم چڑھا۔ بارہ سے بارہ بجے تک اُن کے اعصاب کمان کی طرح تنے رہتے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے بستی بھر کے بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کو بجلی کے تار میں پرو کر برقا دیا ہے۔

امریک سنگھ کا گھر مسجد کے عقب میں واقع تھا۔ اس مسجد کے دامن

میں ایک بھیانک سا واجہ پرورش پا رہا تھا۔ گاؤں بھر میں یہ بات پھیل رہی تھی کہ سرِ شام ہی مسجد کے کنوئیں سے عجیب عجیب ڈراؤنی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں ——— جیسے دو چار بکریوں کو بیک وقت ذبح کیا جا رہا ہو۔

"سالا حرامی" امریک سنگھ کہا کرتا تھا۔ "مرنے کے بعد بھی ڈکرا رہا ہے بھیلے کی طرح۔ ڈال دو کچھ ٹوکرے کوڑے کے کنوئیں میں"

"ارے چھوڑو بھی" امریک سنگھ کا بھائی ترلوک سنگھ مذاق اڑاتا تھا "بانگ دے رہا ہے مُلّا بانگ!"

"خالصہ جی کے راج میں دھرم کی پوری پوری آزادی ہے ——— ال" گیانی دربار سنگھ جبڑے پھاڑ کر ہنستا۔

لیکن امریک سنگھ کی بیوی ڈرتی تھی۔ رات کو سناٹے میں جب مسجد کا کنواں گلا پھاڑ کر چنگھاڑتا تو اس کا تن بدن ٹھنڈے پسینے میں شرابور ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ملّا علی بخش کی تصویر آ جاتی، جو مسجد کے حجرے میں رہا کرتا تھا۔ نحیف بدن، دو ہاتھ کی لمبی داڑھی، آنکھوں پر موٹے گلاس کا چشمہ، سر پر سبز ململ کی بے ڈھب سی پگڑی، ہاتھوں میں رعشہ

گردن میں ابھری ہوئی رگیں۔ لیکن جب وہ صحن میں کھڑا ہو کے پانچ وقت اذان دیتا تو مسجد کے گنبد گونج اٹھتے اور علی بخش کے نحیف و نڈھال گلے سے وہ زناٹے کی آواز نکلتی جیسے بہت سی آبشاریں دست بداماں ہو کر گونج رہی ہوں۔

اذان کی آواز سے امریک سنگھ کی بیوی کو بڑی کوفت ہوتی تھی۔ ایک وقت یا دو وقت کی بات ہوتی تو خیر، لیکن جب دن بھر میں پانچ بار اُسے یہی بول سُننا پڑتے تو وہ گھبرا جاتی۔ اس نے بڑے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ اذان میں کالے جادو کے بول ہوتے ہیں اور جوان عورتیں اُسے سُن کر بانگی جاتی ہیں۔ اگر بن بیاہی نوخیز لڑکی بانگی جائے تو اُس کے بانجھ ہونے کا ڈر تھا۔ اگر بیاہی ہوئی بیوی بانگی جائے تو اس کے حمل گرنے لگتے تھے۔ چنانچہ امریک سنگھ کے گھر میں پشتہا پشت سے یہ رسم تھی کہ ادھر اذان کی آواز فضا میں لہرائی اُدھر کسی نے کنستر کو چمچے سے بجانا شروع کیا۔ کسی نے چمٹے کو توے سے لڑا دیا۔ کوئی کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بیٹھ گئی کوئی بھاگ کر پچھلی کوٹھڑی میں جا گھسی ——— اور اس طرح سارا خاندان اپنی لاڈلیوں کی کوکھ کو کالے جادو کے اثر سے بچا کر ہرا بھرا

رکھتا آیا تھا۔

امریک سنگھ کی بیوی کے بطن میں سوا لاکھ خالصے پرورش پا رہے تھے۔ سکھوں کی گنتی میں ایک سکھ سوا لاکھ انسانوں کے برابر شمار ہوتا تھا۔ آدھی رات گئے جب مسجد کا کنواں امریک سنگھ کی بیوی کے تخیل میں بھیانک اور ہولناک گونج پیدا کر دیتا تو اس کے پیٹ میں خالصوں کی یہ بہادر فوج ہڑبونگ مچانے لگتی۔ کبھی اس کے کانوں میں کنویں کی چنگھاڑیں جگر خراش انداز سے گونجتیں۔ کبھی اس کے تصور میں کنویں کا دہانہ جبڑے پھاڑ کر اس کی طرف لپکتا اور ہر وقت اسے یہ دھڑکا سا لگا رہتا کہ ملا علی بخش کنویں کی دیوار کے ساتھ رینگتا ہوا باہر نکل رہا ہے اور چشم زدن میں کنویں کی منڈیر پر کھڑا ہو کر نہ جانے کس وقت اسے "بانگ" کے دکھ دے گا۔

امریک سنگھ کی بہن کے بطن میں تو ابھی کسی خالصے نے اپنا گھر نہیں جمایا تھا۔ کیونکہ ابھی وہ بن بیاہی تھی لیکن اس کے دل پر سوا لاکھ کا قبضہ تھا بات کہ جب وہ اپنی چارپائی پر لیٹ کر ان میٹھی میٹھی گدگدیوں کو یاد کرتی جو مکئی کے کھیتوں کی اوٹ میں سوا لاکھوں کی بھولی انگلیاں اُن کے

تن بدن کو چھلنی بنا کے رکھ دیتی تھیں تو اس کے سینے میں ارمانوں کا ایک ہجوم سا اُمڈ آتا اور وہ تصور ہی تصور میں اپنے جسم کو جوان جوان قومی خالصوں کے وجود سے آباد کر لیتی —— لیکن پھر مسجد والے کنوئیں کی دلدوز چنگھاڑ اس کے ایوانِ تصور کو مسمار کر کے رکھ دیتی اور معاً اُسے محسوس ہوتا کہ کنوئیں کی عمیق گہرائی سے بھی ملا علی بخش کالے جادو کے بول پکار پکار کر اس کے پیٹ سے جننے والی نسلوں کے ناکے بند کر رہا ہے۔

امریک سنگھ کو اپنی بیوی اور بہن دونوں پر غصہ آتا تھا۔ بزدل کی بچیاں! ملا علی بخش تو کب سے دور دفن ہو چکا تھا۔ جس روز وہ کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھا وضو کر رہا تھا۔ امریک سنگھ نے خود اُسے نیزے کی نوک پر اچھالا، ترلوک سنگھ نے اُس کو اپنی تلوار پر آزمایا، گیانی دربار سنگھ نے اُس کے جھنجھناتے ہوئے خون آلود جسم کو تڑاخ سے کنوئیں میں پھینک ڈالا۔

ایک ملا علی بخش ہی پر کیا منحصر تھا، اب تو پنگورہ کا سارا گاؤں صاف ہو چکا تھا۔ بانگیں دینے اور سننے والوں کا وجود ناپید ہو گیا تھا۔ کچھ بھاگ گئے تھے، کچھ مر گئے تھے اور بہتوں کی گردن پر خالصوں کی مقدس کرپانیں ریزہ ریزہ ہو چکی تھیں —— لیکن یہ ڈرپوک حرام زادیاں تھیں کہ اب بھی وہی بانگوں

کے ڈر سے اپنے بچہ دانوں کو چھپاتے چھپاتے پھرتی تھیں۔ چنانچہ جب امریک سنگھ کی بیوی اور بہن سوتے سوتے چیخ کر چھاتیاں پیٹنے لگتیں تو اس کا دل طیش سے جل کر کباب ہو جاتا اور وہ جوتا اٹھا کر انھیں مار مار کر لہو لہان کر دیتا۔ مارتے مارتے اس کے ہاتھ شل ہو جاتے، بازوؤں میں تھکن آجاتی، رگیں پھول جائیں اور وہ اپنی گنجان داڑھی سے پسینے کے قطروں کو جھاڑتا ہوا دیوانوں کی طرح لپک کر دلشاد کے پاس چلا جاتا۔ جس طرح دائمی زکام کا مریض دماغ کی رطوبت کو ہلکا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً نسوار سونگھ لیا کرتا ہے، اسی طرح گاؤں بھر کے خالصے اپنی وہم آلود بیویوں اور بہنوں سے بھاگ کر اپنے بدن کا فشارِ خون دھیما کرنے کے لیے دلشاد کے پاس چلے جایا کرتے تھے۔

دلشاد کو مسجد میں رکھا گیا تھا کیونکہ حجرے کی چھت جل جلا کر گر چکی تھی۔ یوں تو اُس کے سرمایے میں جسم بھی تھا اور جان بھی۔ لیکن اُس کا عزیز ترین سرمایہ اس کے ابا کی تسبیح تھی۔ ملا علی بخش کے ہاتھ اسی تسبیح پر گھومتے گھومتے بوڑھے ہو گئے تھے۔ پتھر کے گول گول دانوں پر اس کی انگلیوں کے نشان نقشِ فریادی کی طرح پیوستہ تھے۔ سالہا سال کے گریہ

نیم شبی اور فغانِ سحری کے آنسو اس تسبیح میں موتیوں کی طرح پروئے ہوئے تھے۔ یہی چند موتی تھے جن کے وجود سے دلشاد کا لٹا ہوا صدف ابھی تک آباد تھا ——— وہ دن بھر اس تسبیح کو گلے میں ڈال کر قمیض کے نیچے چھپائے رکھتی تھی لیکن شام پڑتے ہی اسے کسی ویران کھنڈر میں دبا دیتی تھی کیونکہ اُسے ڈر تھا کہ کہیں بھنگ اور شراب میں سوئی ہوئی زبانیں اس کے ابا کی انگلیوں کے نقوش کو بھی چاٹ چاٹ کر ناپاک نہ کر دیں۔

آدھی آدھی رات گئے وہ مسجد والے کنوئیں کی منڈیر پہ رویا کرتی تھی۔ اس کی آنکھیں کنوئیں میں ٹکٹکی لگائے پک جاتی تھیں کہ شاید کبھی اس کے ابا کی تیرتی ہوئی پگڑی کی ایک جھلک اُسے دکھائی دے' اس کے کان کنوئیں کی طرف لگے لگے تھک جاتے تھے کہ شاید کبھی اس کے ابا کی آخری سسکی اُسے ایک بار پھر سنائی دے یا وہ خوفناک چنگھاڑیں جنھوں نے گاؤں بھر کی عورتوں کو پریشان کر رکھا تھا، شاید اس کے منتظر کانوں کو بھی نوازیں ——— لیکن کنواں تاریک تھا اور قبر کی طرح خاموش۔ جب کوئی آوارہ چمگادڑ اس میں پُھر پُھر اتی' تو ——— پھر پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ بدبُو اور تعفن کے تیز تیز بھبکے فضا میں منتشر ہو جاتے

تھے۔ کیونکہ سوالاکھ بہادروں نے غلام بخش کا گلا مرنے کے بعد بھی بند رکھنے کے لیے کنوئیں کو غلاظت اور کوڑے کرکٹ سے اٹاٹ بھر دیا تھا۔

دلشاد کا وجود ایک ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح تھا کہ جس کے ٹکڑے آسمان کے ویرانوں میں اکیلے ہی اکیلے بھٹک رہے ہوں۔ آسمان کی بساط لُٹ چکی تھی۔ سورج اور چاند چھپ گئے تھے۔ تاروں کے چراغ بجھ گئے تھے اور وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ بے یار و مددگار۔ مسجد کے دروازے کے ساتھ لگی ہوئی، سہمی ہوئی' گھبرائی ہوئی' حیران۔ . . . لیکن اس کے دم سے مسجد پھر آباد ہو گئی تھی۔ لوگ باریاں باندھ باندھ کر وہاں آتے تھے اور جب وہ بہادر خانۂ محراب کے نیچے بیٹھ کر شراب کا ادھیا کھولتے اور دلشاد کی بوٹیوں کو چوڑ چوڑ کر کھانے کی کوشش کرتے' تو گویا انھیں یہ فخر ہوتا کہ وہ گِن گِن کر ساڑھے تیرہ سو برس کی اذانوں اور نمازوں کا بدلہ چکا رہے ہیں۔

چلکوروں کی مسجد گوردواروں سے بھی زیادہ آباد ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ گاؤں کی بیاہی ہوئی اور بن بیاہی ماؤں کو یہ احساس ستانے لگا کہ غلام بخش کے بعد غلام بخش کی بیٹی ان کی کوکھ لوٹنے پر تُلی ہوئی ہے۔ وہ تو چیخ چیخ کر اپنی چارپائیوں سے لگ کر سو جاتی تھیں لیکن ان کے بہادر خانے رات

رات بھر دلشاد کے ساتھ اپنی آنے والی نسلوں کا سودا کیا کرتے تھے۔

امریک سنگھ، امریک سنگھ کا باپ۔ امریک سنگھ کا بھائی —— ایک خالصے کے بعد دوسرا خالصہ، دوسرے خالصے کے بعد تیسرا خالصہ —— رات بھر وہ نظریں بچا بچا کر، موقعہ جانچ جانچ کر مسجد کے آستانے پر حاضری دیتے تھے۔ بھُنی ہوئی کلیجی اور گُردے اُڑتے۔ تلے ہوئے کبابوں کا دور چلتا۔ شراب اور بھنگ کی باٹیاں بٹتیں اور اپنی نسل بندی کے وہ بیج جن کو ہرا بھرا رکھنے کے لیے ان کی بیویاں سو سو طرح کے جتن کرتی تھیں، وہ بلا دریغ مسجد کی چار دیواری میں بکھیر آتے ——

—— اور ایک دن بیٹھے بٹھائے یکایک دلشاد سرسوں کی طرح پھول اٹھی۔ جب یہ خبر پھیلی تو گاؤں میں آگ سی لگ گئی۔ بیویوں نے چیخ چیخ کر اپنا سر پیٹ لیا۔ کنواری لڑکیوں نے رو رو کر آنکھیں سُجا لیں اور مکئی کے کھیتوں میں چھپ چھپ کر اپنے خاصموں سے منہ چھوڑ دیا۔ کنویں کی چلچلاہٹیں تیز تر ہونے لگیں۔ گھروں میں فٹ پر فٹ آنے لگے۔ چھٹے پر چھٹے چلنے لگے۔ ایک کہرام سا مچ گیا۔

پہلے تو سب کی یہ رائے ہوئی کہ بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی دلشاد

کو مار کے کنویں میں پھینک دیا جائے۔ لیکن پھر امریک سنگھ کو ایک منصوبہ تجویز سوجھی۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ ایک روز صبح سویرے وہ اسے اپنی بیل گاڑی پر بٹھا کے پاس کے تھانہ میں لے گیا اور اغوا شدہ مسلمان عورتوں کی برآمدگی کے سلسلہ میں اپنی کوششوں کا عملی ثبوت دینے کے لیے دلشاد کو پیش کر دیا۔

تھانیدار بھورام نے امریک سنگھ کی کارگزاریوں کو خوب سراہا —— پولیس کی طرف سے شکریہ کا ایک پروانہ اسے عطا کیا اور ڈپٹی کمشنر بہادر سے بھی سند دلوانے کا وعدہ فرمایا —— پھر تھانیدار صاحب نے عینک اٹھا کر دلشاد کا جائزہ لیا۔ قبول صورت جوان، ذرا چلبلی سی لیکن گرم گرم، گداز —— —— لیکن جب ان کی نظر دلشاد کے پیٹ پر پڑی۔ تو ان کی ابھری ہوئی امیدوں کو ایک زبردست دھکا لگا۔ پہلے تو انھوں نے سوچا کہ اگر دس بیس دن کی بات ہو، تو وہ اسے بھی تھانہ ہی میں رکھ لیں۔ لیکن جب ہیڈ کانسٹیبل دریودھن سنگھ نے جوڑ توڑ کے حساب لگایا کہ ابھی "خلاصی" ہونے میں تین ساڑھے تین مہینے باقی ہیں تو تھانیدار بھورام کو بڑی مایوسی ہوئی۔ پھر بھی رات کو کھانا کھا

کہ جب وہ ایک پتلی سی بنیان اور جانگیہ پہن کر چارپائی پر لیٹے تو انھوں نے دلشاد کو پاؤں دبانے کے لیے اپنے پاس بلا لیا۔ جاتے جاڑے کی لنگوٹی ہی سہی۔ تھانیدار صاحب کے پاؤں کا درد بڑھتے بڑھتے پنڈلیوں میں آ گیا پھر گھٹنوں میں۔ پھر رانوں کے اندر، پھر کولہوں کے آس پاس —— —— اور وہ دلشاد کا ہاتھ پکڑ کر اپنی دکھتی ہوئی رگوں کا درد دبواتے رہے۔ تھانیدار صاحب کے نزدیک خواہش کا دوسرا نام تسکین تھا۔ جاں ہوا تو کیا، چنیں ہوا تو کیا؟

دلشاد کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ پچھلے چند مہینوں میں اس نے زندگی کے پیچ کچھ اس طرح کھولے تھے کہ اس کے بدن کی بوٹی بوٹی گویا مرہم کا پھاہا بن کر رہ گئی تھی۔ جو کوئی اسے جان سے جی چاہتا لگا لیتا اور اس کے جسم کا ہر حصہ بھڑکتے ہوئے، اینٹھتے ہوئے، بے چین انسانوں کو چند ہی منٹوں میں تسکین کا جام پلا دیتا تھا۔ لیکن اس کی اپنی رگ رگ میں کتنے پھوڑے تھے، کتنی ٹیسیں تھیں، کتنے رستے ہوئے زخم تھے۔ کاش! رحیم خاں ہوتا تو دیکھتا۔

دلشاد کو اپنے آپ پر بھی غصہ آتا تھا کہ اس نے بیچارے رحیم خاں

کو اتنی بار ناحق رسوا کیا تھا۔ ایک روز جب اس نے اسے زبردستی چومنے کی کوشش کی تھی تو دلشاد نے غصے سے اس کے منہ پر ایسا دوہتڑ مارا تھا کہ اس کی چوڑیاں ٹوٹ کر رحیم خاں کے ماتھے میں گڑ گئی تھیں اور وہ خود ساری رات انگاروں پر لوٹتی رہی تھی کہ نہ جانے خدا اور رسول رحیم خاں کو اس گناہ کی کیا سزا دیں گے؟ بیچارہ رحیم خاں!

پندرہ بیس دن کے بعد جب تھانیدار صاحب کے گھٹنوں اور کولہوں اور کمر کا درد ذرا کم ہوا تو انھوں نے دلشاد کو چھٹی دی اور ہیڈ کانسٹیبل دریودھن سنگھ کے ساتھ اسے انبالہ کیمپ بھیج دیا گیا۔ راستے میں ہیڈ کانسٹیبل دریودھن سنگھ کے کولہوں اور گھٹنوں میں بھی کئی بار درد اٹھا۔ لیکن دلشاد بڑی تندہی سے اس کے درد کا مداوا کرتی رہی اور دس گھنٹے کی مسافت انھوں نے دس بارہ دنوں میں بخیر و عافیت طے کر لی۔

انبالہ کیمپ میں بہت سی لڑکیاں تھیں، بہت سی عورتیں۔ جوان بھی، خوبصورت بھی۔ لیکن ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح کہ جن کے شعلے بجھ گئے ہوں، جن کی کہکشاں لٹ گئی ہو، جن کی تقدیروں پر کیچڑ اچھال دیا گیا ہو۔

ہر روز فوج کے ٹرک آتے تھے اور نئی نئی لڑکیوں کی نئی نئی ٹولیاں

انبالہ کیمپ میں چھوڑ جاتے تھے۔ ناموس اور تقدس کی تسبیح کے یہ بکھرے ہوئے انمول موتی پھر اپنے مرکز کی طرف جمع ہو رہے تھے۔ لیکن ابھی ان پر اپنے "سبحان" اپنے "غفور الرحیم" اپنے "پاک پروردگار" اپنے "قادرِ مطلق" کی حمد کا وظیفہ شروع نہ ہوا تھا۔ بلکہ کیمپ کمانڈر میجر پریتم سنگھ اور اس کے جوانمرد سپاہی ابھی تک ان پر گرو کی بانی جپتے تھے۔ خیر دلشاد کو اب ایک قسم کی چھٹی تھی۔ یوں تو نیک اولاد ہمیشہ اپنے ماں باپ کا سہارا ہوتی ہے لیکن دلشاد کو اپنے ہونے والے بچے پر بڑا ہی بھروسا تھا کہ اس نے پیدا ہونے سے پہلے ہی اپنی مجبور ماں کو اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔

انبالہ کیمپ کے پہلو میں ریلوے لائن تھی۔ سورج کی روشنی میں ریل کی پٹڑیاں چاندی کے تار بن کر چمکتی تھیں اور دور، بہت دور مغرب کی طرف ان کی نقرئی لڑیاں خوابوں کے سہانے جزیروں میں گم ہو جاتی تھیں۔ ان جزیروں کے کہیں آس پاس دوزخ کی سرحد جنت کی سرحد سے ملتی تھی اور کیمپ کی عورتیں ریل کی پٹڑیوں کو چھو چھو کر سرشار ہو جاتی تھیں کہ ان کا دوسرا سرا مشرقی پنجاب میں نہیں مغربی پنجاب میں ہے۔ مغربی پنجاب!!

مغرب کا خیال آتے ہی دلشاد کی راکھ میں ایک ننھا سا چراغ ٹمٹما اٹھتا۔

مغرب میں کعبہ ہے۔ کعبہ اللہ میاں کا اپنا گھر ہے۔ لیکن کیمپ کی دوسری عورتیں کہتی تھیں کہ مغرب میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ وہاں ہمارے بھائی ہیں، ہماری بہنیں ہیں، ہمارے ماں باپ ہیں۔ وہاں عزت ہے۔ وہاں آرام ہے ــــــ دلشاد سوچتی تھی کہ شاید وہاں رحیم خاں بھی ہو! یہ خیال آتے ہی اس کے جسم کا رواں رواں مچل اٹھتا اور وہ بے چین ہو جاتی کہ پر لگا کر اڑ جائے اور اپنے تھکے ہوئے، دُکھے ہوئے جسم پر اس ارضِ مقدس کی خاک مَل لے۔

ہفتہ، دو ہفتے، مہینہ، دو مہینے ــــــ دن گزرتے گئے۔ راتیں بیتتی گئیں اور مغرب کا خوش آئند تصور دلشاد کے سینے میں امیدوں کا نور پھیلاتا رہا۔ انبالہ کیمپ کی آبادی بڑھتی گئی اور جب میجر پریتم سنگھ اور اس کے جوانوں کا دل اچھی طرح سیر ہو گیا تو ایک دن وہ ریل بھی آ گئی جس کے انتظار میں امیدوں کے چراغ ابھی تک جل رہے تھے۔ جب وہ ریل کے ڈبے میں سوار ہوئی تو دلشاد کو ملا علی بخش کی یاد آئی وہ بھی اسی طرح ریل میں بیٹھ کر حج کو روانہ ہوا تھا۔ گلے میں ہار تھے، کپڑوں پر عطر تھا اور

گاؤں کے لوگ باجا بجاتے ہوئے اس کے ساتھ اسٹیشن تک آئے تھے۔

———— !

ریل کے ہر فراٹے کے ساتھ عورتوں کے ٹوٹے ہوئے آبگینے جھنجھنا اٹھتے تھے۔ پہیئوں کی ہر گردش کے ساتھ ان کے جسم اور روح کا ایک بل نکل جاتا تھا جب وہ کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر تار کے کھمبوں کو دیکھتیں جو بڑی سرعت کے ساتھ پیچھے کی طرف بھاگ رہے ہوتے' تو انھیں یقین سا ہو جاتا کہ وہ آگے ہی کی طرف جا رہی ہیں۔ زمین کا جو چپہ چپہ ان کے نیچے سے نکلتا وہ انھیں مشرقی پنجاب سے اٹھا کر مغربی پنجاب کے قریب تر لے جاتا۔ اگر کہیں گاڑی رکتی' تو ساری کائنات دم سادھ لیتی۔ وقت کی رفتار ساقط ہو جاتی اور انھیں یہ ڈر لگتا کہ شاید انجن کے سامنے اچانک بڑے بڑے پہاڑ آ گئے ہیں۔ جب گاڑی دوبارہ چلتی تو دل کی دھڑکنیں جاگ اٹھتیں' سینوں کے ارمان تازہ ہو جاتے اور وہ کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال نکال کر اس ہوا کو چھونے کی کوشش کرتیں' جو مغرب کی سمت سے آ رہی تھی!

لدھیانہ' پھلور' جالندھر ——— امرتسر ——— ہر

منزل پر عورتوں کی زندگی کے بند کھلتے گئے۔ ان کی خاک میں سوئے ہوئے نغمے بیدار ہونے لگے۔ وہ گنگنانے لگیں۔ وہ مسکرانے لگیں۔ وہ آنکھیں مل مل کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ جیسے کسی بھیانک خواب کو بھلانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کسی نے بالوں میں کنگھی کی۔ کسی نے دوپٹہ کے ساتھ دانتوں کی میل اتاری۔ کوئی کپڑے جھاڑنے لگی۔ کوئی بچوں کو لوریاں سنانے لگی۔ کچھ عورتوں نے سر سے سر جوڑ کر گیت گائے۔ پیارے پیارے رس بھرے' دلربا گیت' کہ "اے کالی کملی والے' میں تیری یثرب نگری میں آئی ہوں ـــ" "مجھے اپنی کملی میں چھپا لے۔ مجھے اپنے پاؤں کی خاک بنا لے ———"

جب گاڑی امرتسر کے اسٹیشن سے نکلی' تو کسی نے کہا کہ اب صرف ڈیڑھ گھنٹے کا سفر اور ہے۔ بس ڈیڑھ گھنٹہ اور! ساٹھ اور تیس نوے منٹ! یہ ناقابل یقین خیال عورتوں کے تن بدن پہ شراب کے تیز و تند نشے کی طرح چھا گیا۔ اپنی منزل کو اتنا قریب پا کر وہ شدتِ احساس سے مفلوج سی ہو گئیں۔ پچھلے بھیانک مہینوں کی یاد زہر بن کر ان کے سینے میں عود کر آئی۔ ماضی کی ہولناک حقیقت مستقبل کے سہانے ارمانوں پر غالب آ گئی

یکایک اُن کو اپنے شاداب گاؤں یاد آنے لگے۔ اپنے جوان جوان بھائی اپنے نحیف نحیف ماں باپ، جن کے بے گور و کفن لاشے گلیوں میں پڑے سڑ رہے تھے۔ اپنی اُداس اُداس بہنیں جو کیمپوں میں بیٹھی فرشتوں کا انتظار کر رہی تھیں کہ وہ انھیں اپنے نوری پردوں میں چھپا کر لے جائیں۔

دُور، کہیں بہت دُور، مغرب کی طرف ———— وہ رونے لگیں۔ اُن کے گالوں پر آنسوؤں کے پرنالے بہنے لگے۔ دلشاد بھی رو رہی تھی، بلک بلک کر، سسک سسک کر اور آنسوؤں کا نمکین پانی اس کے ہونٹوں پر پہاڑی چشموں کی طرح اُبل رہا تھا۔ وہ روتی گئی، وہ روتی گئی اور اشکوں کی دبیز چادر نے اُس کی پلکوں کو اپنے دامن میں چھپا لیا۔ ایک عجیب سی غنودگی، ایک عجیب سا خمار اس کے رویں رویں پر چھا گیا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ سمندر کی اتھاہ لہروں میں غوطے کھا رہی ہے اور بے شمار سنپولیے اُس کے تن بدن پر رینگ رہے ہیں ——— رینگ رہے ہیں!!

ربّ المغربین

مری دنیا میں تیری پادشاہی

جب اس کی آنکھ کھلی تو ریل کا ڈبہ خالی ہو چکا تھا۔ اسٹیشن کی ایک مہترانی ڈبے کے فرش کو پانی سے دھو رہی تھی۔ دلشاد کے پہلو میں ایک ننھی سی بچی رو رہی تھی۔ صبح کی فضا سورج کی کنواری کرنوں میں نہا رہی تھی۔ درختوں پر چڑیاں پھدک رہی تھیں۔ گھاس پر شبنم کے موتی چمک رہے تھے۔ اسٹیشن پر چہل پہل تھی۔ ایک گرم چائے والا کھڑکی کے پاس خوانچہ لگائے دودھ اُبال رہا تھا۔

دلشاد اٹھ کر کھڑکی کے سہارے بیٹھ گئی۔ اس نے نقاہت سے چائے والے سے پوچھا: "کیا یہ مغرب ہے بھائی؟"

چائے والا اپنے پیلے پیلے کریہہ المنظر دانت نکال کر ہنسا "کیوں؟ کیا نماز پڑھوگی اس وقت؟"

اسٹیشن کی مہترانی جب ڈبے کے فرش کو دھو چکی تو اس نے اپنی محنت کے صلے میں دلشاد سے ایک چونی مانگی۔ پھر مایوس ہو کر اس نے دلشاد کو چند غلیظ گالیاں دیں۔ "سارا ڈبہ پلید کر دیا رانڈ نے ذرا صبر نہ ہو سکا؟ راستے ہی میں جن بیٹھی ———— !" سٹیشن کی مہترانی جا کر ایک مضبوط سے مہتر کو اپنے ساتھ لے آئی اور دونوں نے مل کر دلشاد کو ڈبے سے نکال دیا۔

پلیٹ فارم پر ایک سامان لادنے والا ٹھیلا کھڑا تھا۔ دلشاد اس کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ گئی۔ سامنے چائے کا سٹال تھا۔ تانبے کے چمکدار سماوار سے ابلتے ہوئے چائے کے بھبکے پیچ در پیچ نکل رہے تھے جیسے کسی نازنین کے گیسو ہوا کے دوش پر لہرا رہے ہوں۔ اس کے آگے پھلوں کی دوکان تھی۔ رنگ برنگ کا غذوں پر کندن کی طرح دمکتے ہوئے کیلے سنگترے اور مالٹے سجائے رکھے تھے۔ ایک کٹا ہوا سرخ انار چھابڑی میں پڑا تھا۔ چھت کے ساتھ انگوروں کے بڑے بڑے خوشے لٹک رہے تھے

دلشاد کا گلا کانٹے کی طرح خشک تھا۔ اس کی زبان پر گدلے گدلے میلے میلے لعاب کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اس کے پیٹ میں ایک عجیب سا بخار سلگ رہا تھا۔ اس کی کمر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور اس کا سارا بدن ایک دُکھتے ہوئے پھوڑے کی طرح چُر مُر کر رہا تھا۔

دلشاد نے اپنی خشک زبان ہونٹوں پر پھیری۔ اس کی ننھی سی بچی چوہیا کی طرح اس کے سینے سے چمٹی ہوئی چپ چپ دودھ پی رہی تھی۔ کبھی وہ سوچتی تھی کہ شاید وہ رات بھر سوتی ہی رہی اور مغرب کی سُہانی منزل مقصود کو پیچھے چھوڑ آئی۔ کبھی اسے خیال آتا کہ شاید اسی سٹیشن کی فلک بوس عمارت کے پیچھے اس کا رحیم خاں اس کے انتظار میں کھڑا ہو یا شاید وہ لوگوں کے ان جمگھٹوں میں کھویا ہوا اُسے تلاش کر رہا ہو جو پلیٹ فارموں پر ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔

وہ کوشش کر کے اٹھی کہ لوگوں کے ہجوم کے قریب ہو جائے لیکن اس کے گھٹنے لڑک سے بج کر رہ گئے۔ اس کی پنڈلیوں میں رعشہ سا آ گیا اور وہ سر تھام کر ٹھیلے کے سہارے پھر بیٹھ گئی۔

دو خوش پوشش، خوش شکل جوان لڑکے ہاتھ میں ہاتھ دیئے پلیٹ فارم

پر ٹہل رہے تھے۔ ایک سگریٹ پی رہا تھا۔ دوسرے کے پاس سگار تھا جب وہ دلشاد کے سامنے سے گزرتے تو دور تک پیچھے مڑ مڑ کر اُسے دیکھتے رہتے۔ رفتہ رفتہ ان کے چکروں کی طوالت کم ہوتی گئی اور بالآخر وہ دلشاد کے عین سامنے کھڑے ہو گئے۔ دلشاد کا دل زور زور سے پسلیوں کے ساتھ ٹکرانے لگا۔ ہم رہا کا ایک عجیب سا تانا بانا اُس کے دماغ پر چھا گیا۔

چکوڑ کی مسجد میں اگر کوئی اُسے گھور کر دیکھتا تو وہ بے بسی کے عالم میں اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ کے بیٹھ جاتی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اگلے لمحے گھورنے والے کے ہاتھ اُس کا گوشت نوچ کھسوٹ کر رکھ دیں گے۔ لیکن ریل میں بیٹھ جانے کے بعد اس نے ان خوشگوار توقعات کا سہارا پکڑ لیا تھا، جو مغرب کے تصور سے اس کے دل اور دماغ میں بسی ہوئی تھیں اس لیے وہ سوچنے لگی کہ شاید یہ خوبصورت جوان وہ مہربان بھائی ہوں جن کے خون کی کشش ابا کیمپ کی عورتوں کو ہر لحظہ اپنی طرف کھینچا کرتی تھی۔ اس خیال سے دلشاد کے دل میں خوشی کی ایک سرسی ناچی۔ وہ تو مسکرانا بھی چاہتی تھی، لیکن اُس کے بدن میں درد کی ٹیسوں کا طوفان سا اٹھا ہوا تھا اس لیے وہ باوجود کوشش کے ظاہری طور پر بھی مسکرا نہ سکی۔ پھر بھی محبت

کا جتنا نوچ اس کا دکھتا ہوا، ڈستا ہوا جسم اکٹھا کر سکتا تھا، اس نے اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر اُن نوجوانوں کی طرف بڑے پیار سے دیکھا۔

"انور!" ایک نوجوان سگریٹ کا دھواں دوسرے کے منہ پر چھوڑ کر گرمجوشی سے مسکرایا۔

"رشید" دوسرے نوجوان نے گرمجوشی کا جواب گرمجوشی سے دیا۔

انور! رشید!! دلشاد گویا سرشار ہو گئی۔ یہ دو نام اس کے کانوں میں آبِ حیات سا ٹپکا گئے۔ مہینوں سے وہ ایسے ہی نام سننے کے لیے ترس گئی تھی۔ اس کے کانوں کے انور، رشید، محمود، نسیم، خالد، جاوید تو مدت سے مٹ گئے تھے۔ ان کی جگہ اس کے تصور میں اب شمشیر سنگھ امریک سنگھ، کرتار سنگھ، تریلوک سنگھ، پنجاب سنگھ، سورمکھ سنگھ اور دربار سنگھ کے نام اژدہوں کی طرح لہراتے تھے۔ ان ناموں کا زہر اس کی رگ رگ میں خون کی طرح سرایت کر چکا تھا۔ ان کی سڑاند اس کے روئیں روئیں میں بسی ہوئی تھی۔ ان کا وحشی اُبال اس کی ہڈیوں میں درد بن کر رچا ہوا تھا لیکن اب جو اس کے کانوں نے رشید اور انور کے نام سنے تو اُسے

یوں محسوس ہوا جیسے وہ آبِ کوثر سے نہا رہی ہو۔ جیسے وہ پاک و مصفّا پانی اس کے گلے ہوئے، سڑے ہوئے جسم پر گلاب اور کافور کی خوشبو میں چھڑک رہا ہو ——— اس کی گری ہوئی گردن میں افتخار کا ابھار آ گیا۔ اس کے مایوس اور غم دیدہ سینے میں امید و مسرت کی کرنیں پھوٹ اٹھیں اور اس نے ہاتھ کے اشارہ سے اُن دو جوانوں کو اپنے قریب بلایا۔

"یہ کیا جگہ ہے بھائی؟" دلشاد نے پوچھا۔

"لاہور ہے"۔ انور نے کہا۔

"تم کہاں جاؤ گی؟" رشید نے پوچھا۔

"جہاں قسمت لے جائے"۔

"باپ رے باپ!" انور نے رشید سے سرگوشی کی۔

"بڑی سپورٹ ہے بھائی!" رشید نے انور کو آنکھ ماری۔

"آؤ بہن، تم ہمارے ساتھ چلو"۔ دونوں ہمزبان ہو کر بولے۔

جب دلشاد عقیلہ کا سہارا لے کر اٹھی تو اس کے بھائیوں کو پہلی بار اپنی ننھی سی بھانجی کی جھلک دکھائی دی۔

"ارے" انور حیرانی سے اچھلا۔

"یہ کیا بلا ہے؟" رشید نے پوچھا۔

"لڑکی ہے جی"۔ دلشاد کچھ ہچکچائی، کچھ شرمائی۔

"بڑی چھوٹی سی ہے"۔ انور نے جائزہ لیا۔

"ایک ہی دن کی ہے جی"۔ دلشاد آخر بھائیوں سے کیا کہے، کیا نہ کہے۔

"آخ تھو" انور کو اُبکائی سی آئی۔

"لاحول ولا قوۃ" رشید کا جی متلایا

وہ دونوں بھائی قے کرتے کرتے بچے، اور تیز تیز قدم وہاں سے چلے گئے۔ سامنے والے پلیٹ فارم پر ایک خوبصورت عورت بھڑکیلی سی شلوار اور قمیض پہنے جا رہی تھی۔ اس کا دھانی دوپٹہ اس کے سڈول شانوں پر لہرا رہا تھا۔ رشید اور انور نے چھلانگیں مار کر ریل کی پٹڑی کو عبور کیا اور ہاتھوں میں ہاتھ دیے اس خوبصورت عورت کے تعاقب میں چل کھڑے ہوئے۔

دوپہر کے وقت سٹیشن کی رونق ذرا ڈھل گئی۔ دھوپ میں تمازت

کا اثر بڑھ گیا اور مہربان سورج کی کرنیں دلشاد کے دُکھتے ہوئے جسم کی ٹکور کرنے لگیں۔

ایک انگریز اپنی میم کے ساتھ پلیٹ فارم پہ دھوپ سینک رہا تھا ان کا چھوٹا سا لڑکا دلشاد کے قریب اپنے کتے سے کھیل رہا تھا جب اس نے دلشاد کی ننھی سی لڑکی کو دھوپ میں بیٹھے ہوئے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں مارتے دیکھا تو اس کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیل گئیں اور وہ خوشی سے چیختا ہوا بھاگا اور اپنی ماں کو یہ عجوبہ دکھانے کے لیے گھسیٹ کر لے آیا۔

"واؤ وَنڈرفل ممی، واؤ ونڈرفل!" بچہ چیخ رہا تھا اور حیرت اور مسرت سے اس کی آنکھیں پھٹی جاتی تھیں۔

دلشاد کی بیٹی ایک چھیتی سی چادر میں لپٹی ہوئی اپنے ننھے ننھے گھونسے تان کر آسمان کو دکھا رہی تھی اور اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں ارضِ خدا کی کوزمین کو اپنی ٹھوکروں سے دھتکار رہے تھے۔ انگریز کا بچہ اس ننھی سی چیز کو دیکھ دیکھ کر تالیاں بجاتا تھا، ناچتا تھا اور ہر لحظہ کوشش کرتا تھا کہ وہ اچک کر اس جاندار کھلونے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لے۔ اُس

اس کی ماں نے اُسے ڈانٹا کہ دوسرے کی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا کرتے۔

لڑکا مچل گیا۔

"ہم تم کو ایسا ہی کھلونا لا دیں گے۔" لڑکے کے باپ نے اُسے چمکارا ——

"جھوٹ" لڑکا رو رہا تھا۔

"ہاں، ہاں بچے، ہم ضرور تم کو ایسا ہی کھلونا لا دیں گے۔" لڑکے کی ماں نے وعدہ کیا۔

"تم کب مجھے ایسا ہی کھلونا لا دو گے؟" لڑکا بات پکی کرنا چاہتا تھا۔

"بہت جلد، میرے بیٹے، بہت جلد۔" باپ نے اپنی بیوی کے گاؤن کا جائزہ لیا۔ جس کی گولائی پیٹ کے اوپر بہت پھیلی ہوئی تھی۔ بیوی نے شرما کر منہ پھیر لیا۔

"ممی! اس کھلونے کو چاکلیٹ دو!"

"نہیں بیٹے، یہ چاکلیٹ نہیں کھا سکتی۔"

"اچھا تو ممی، اسے ایک عمدہ سا سوٹ دو۔"

"ہاں میرے ڈارلنگ' ہم اسے کپڑا دیں گے"۔

"اور پیسے بھی' میری ممی!"

"ہاں' پیسے بھی میرے ڈارلنگ"۔

لڑکا خوشی سے چیخ چیخ کر پھر تالیاں بجانے لگا اور جب اس کا جی اس کھیل سے بھر گیا تو اس کی ماں نے دلشاد کو اونی کپڑے کا ایک ٹکڑا اور پانچ روپے دیے۔ جب وہ جانے لگے' تو دلشاد نے دل ہی دل میں اس بچّہ کو دعا دی۔ جو پہلی بار اُس کی زندگی میں رحمت کا فرشتہ بن کر نازل ہوا تھا۔

جب دلشاد کے ہاتھ میں پیسے آ گئے' تو دنیا کے ساتھ اس کا رشتہ از سرِ نو قائم ہو گیا۔ ایک چائے والے نے اس کے پاس آکر "گرم چائے" کی ہانک لگائی۔ ایک "گوشت روٹی" والا بھی اس کے نزدیک اپنا خوانچہ لے آیا۔ اور جب دلشاد روٹی کھانے لگی تو ایک کتا بھی زبان نکال اس کے سامنے آ بیٹھا۔

قریب ہی ایک بنچ پر دو بزرگ بیٹھے رائے زنی فرما رہے تھے۔ ایک کی داڑھی سفید تھی' دوسرے کی خاکی۔ دونوں کچھ دیر سے انگریز

اس کی میم اور بچے کی حرکات پر ناک بھوں چڑھا رہے تھے۔ جب میم نے دلشاد کو اونی کپڑا اور پانچ روپے خیرات دیے' تو ان دونوں بزرگوں کو یہ محسوس ہوا کہ اس فرنگن نے ان کی داڑھیوں کو پکڑ کر زور سے جھٹک دیا تھا۔

"لاحول ولا قوۃ"۔ ایک حضرت خفا ہوئے۔ "یہ حرامی اب تک سمجھتے ہیں کہ ہم انھیں کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں"۔

"ارے میاں قصور ان کا نہیں"۔ دوسرے صاحب نے فیصلہ صادر کیا۔ "دیکھو نہیں اس کم بخت عورت نے ایسی ذلیل خیرات کو نفرت سے ٹھکرا دیا؟"

"اللہ اللہ آزادی تو ملی' لیکن غلامی کا چسکا نہ گیا"۔

"جانے کیسے میرے بھائی' جانے کیسے؟ جب ایسے آقاؤں کی جوتیوں کے صدقے مفت کی گوشت روٹی ملے تو آزادی کی محنت کا بار کون اٹھائے؟"

"اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی"۔ پہلے بزرگ نے رقّت سے الاپا۔

دوسرے حضرت نے بھی آزادی اور خودی کی عظمت میں کچھ مصرعے

ارشاد فرمائے، جب دلشاد چار آنے کے گوشت، تین آنے کی روٹی اور دو آنے کی چائے سے اپنے دوزخِ شکم کو ایندھن دے چکی تو وہ دونوں بزرگ جنبش فرما کر اس کے پاس آئے۔

"اے عورت کیا تم مہاجر ہو؟" ایک نے خشمگیں انداز سے پوچھا، جیسے زمانۂ سلف کا قاضی کسی زانیہ عورت سے خطاب کر رہا ہو۔

"جی نہیں، میرا نام دلشاد ہے۔"

"ارے ہو گا، لا حول ولا قوۃ۔ ہم پوچھتے ہیں تم کہاں سے آئی ہو؟ کہاں جاؤ گی اور یہاں پر تمہارا کیا کام ہے؟" دوسرے حضرت نے مہاراز کی۔

اے کاش دلشاد کو معلوم ہوتا کہ اس کی منزلِ مقصود کا نشان —— کس شاہراہ پہ ملے گا۔ اس کے تخیل میں تو مغرب کی ساری کائنات اس کی منزل تھی۔ وہ تو ایک ایسی وسیع برادری میں شامل ہونے والی تھی، جس میں اسے سارے اپنے ہی اپنے نظر آتے ہوں۔ لیکن یہاں کی اینٹ اینٹ اس سے پوچھتی تھی کہ تم کون ہو؟ تم کیا ہو؟ تمہاری جیب میں پیسے ہیں ——؟ تمہارے جسم میں تازگی ہے؟ ——————

"تم مہاجر ہو۔" ایک بزرگ نے فتویٰ دیا۔ "تم مہاجر خانے چلی جاؤ۔"

"آزاد قوم کی بیٹیاں بھیک کے ٹکڑوں پر نہیں پلتیں، ہاں!"

"تم کوئی بچہ نہیں ہو۔ تمہیں خود شرم آنی چاہیئے۔"

دلشاد دیر تک بیٹھی سوچتی رہی کہ شاید وہ بزرگ مہاجر نام کی لڑکی کی تلاش میں تھے۔ جو کوئی گناہ کبیرہ سرزد کر کے گھر سے بھاگ گئی تھی۔ لیکن شام تک بہت سے لوگوں نے اُسے یہی پکارا اور سب نے اُسے مہاجر خانے ہی چلے جانے کی تلقین کی۔

مہاجر خانہ —————— مسافر خانہ کے وزن پر۔ ایک دفعہ جب دلشاد اپنے ابا کے ساتھ شہر گئی تھی تو وہ دونوں حاجی موسٰی کے مسافر خانے میں ٹھہرے تھے —————— مسافر خانے میں چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں تھیں ایک بھٹیارن اوپلوں کی آگ پر ماش کی دال اور چپاتیاں پکا رہی تھی جب دلشاد اس کے پاس چٹائی پر کھانا کھانے بیٹھی، تو بی بھٹیارن نے بہت سا گھی پیاز کے ساتھ بگھار کر اُس کی دال میں ڈالا اور گرم گرم روٹیوں پہ تازہ مکھن رکھ کر کھانے کو دیا۔ رات کو جب ابا علی بخش عشا کی نماز پڑھنے لگا، تو بھٹیارن دلشاد کی چارپائی کے ساتھ اپنی چارپائی لگا کے لیٹ

گئی اور دیر تک اسے قرمدار کا خیال ستاتی رہی۔ کبھی سات بیٹیوں والے راجہ کا قصہ، کبھی پریوں کی بادشاہ زادی کا افسانہ۔ کبھی اپنے بٹیارے کی جیون کہانی بٹیارن کئی دفعہ روتی، کئی دفعہ ہنستی۔ اور آج تک جب دلشاد شہر کی بارونق سڑکوں کا تخیل باندھتی، تو اس کے پردۂ خیال پر حاجی موسیٰ کی سرائے کا عکس ابھر آتا اور اس بٹیارن کی تصویر بھی جو کبھی روتی تھی، کبھی ہنستی تھی، اور کبھی دلشاد کو گرم گرم چپاتیوں پر مکھن کے پیڑے رکھ کر کھانے کو دیتی تھی۔

مہاجر خانہ ——— شاید مسافر خانہ کا بگڑا ہوا نام ہو۔ جیسے گاؤں والے ہسپتال کو ڈاک خانہ کہتے ہیں۔ شاید شہر والے مسافر خانہ کو مہاجر خانہ کہتے ہوں ——— لیکن اسے کو اپنا نیا نام کچھ زیادہ پسند نہ آیا۔ مہاجر بھی کوئی نام سا نام ہے بھلا؟ دلشاد تو بڑا رسیلا نام تھا۔ اس نام کے ساتھ ملا علی بخش کی یاد وابستہ تھی جس نے قرآن شریف سے فال نکال کر اسے یہ نام دیا تھا۔ اسی ایک نام میں رحیم حسان کا افسانہ محبت بھی منظوم تھا۔ وہ دلشاد کے ساتھ آباد' جیداد' حبیب داد کے قافیے باندھ کر بڑے رس بھرے دوہے گایا کرتا تھا۔

مہاجر خانہ ——— جب وہ مہاجر خانے پہنچی تو لاہور کے تانوں پر رات کے گیدڑ چیل رہے تھے۔ مہاجر خانے کا افسر ایک چھولداری میں دوجبڑ گھونسلے بیٹھا تھا۔ کچھ توقف کے بعد دلشاد کی باری آئی

"نام؟" افسر نے طوطے کی طرح رٹا ہوا سوال دہرایا

"... دلشاد"

"عمر؟"

"بیس سال"

"باپ کا نام؟"

"ملا علی بخش"

"زندہ ہے یا مر گیا؟"

"مار ڈالا گیا"

"گاؤں؟"

"چکوڑہ"

"ضلع؟"

"انبالہ"

جدہ کی دوبارہ سیر

شام میں ہماری بیگم کی خالہ کا جدہ سے فون آیا کہ کل فیصل میاں کو بھیج رہی ہوں' تم لوگ ایک دو روز کے لیے یہاں آ جاؤ۔ دوسرے دن فیصل کا فون آیا کہ عشاء کی نماز کے بعد باب عبدالعزیز کے سامنے کلاک ٹاور پر پہنچ جائیں۔ میں وہیں ملوں گا۔ ہم دونوں وہاں پہنچ گئے' فیصل ہمیں لینے آئے ہوئے تھے۔ رات دس بجے جدہ پہنچے' سب کے ساتھ کھانا کھایا' رات گئے تک گپ شپ ہوتی رہی۔ فجر کی نماز پڑھ کر پھر سو گئے۔ شام کو فیصل میاں کے ساتھ جدہ کی سیر کی۔

جدہ کراچی کی طرح بہت بڑا کمرشل سٹی ہے۔ پرانا جدہ جسے بلد کہتے ہیں' اب ہول سیل مارکیٹ اور سونے کی خریداری کا مرکز بن گیا ہے۔ جدید جدہ بڑی بڑی عالی شان عمارات اور مارکیٹوں کا حسین منظر پیش کرتا ہے۔ جدہ کا ہر چوک اچھوتا منظر پیش کرتا ہے۔ کسی چوک پر بہت بڑی سائیکل بنی ہوئی ہے اور اسے لوگ مذاقاً بابا آدم کی سائیکل کہتے ہیں۔ کہیں بڑی ساری صندوقچی ہے جس میں بڑے بڑے ہار اور زیورات لگے ہوتے ہیں۔ اسے اماں حوا کی صندوقچی کہتے ہیں۔ کورنش کے پاس روشنیوں سے جگمگاتی بگھیاں کھڑی ہوتی ہیں' جن میں لوگ سمندر کنارے کی سیر کرتے ہیں۔ کہیں پانی کا جہاز' کہیں گلوب اور کہیں سماوار کی کہکشاں نظر آتی ہے۔ وہاں کے مشہور شاپنگ سینٹرز جیانٹ' آئی کیا اور سٹی سینٹر جیسے بے شمار شاپنگ پلازا

ہیں۔ ہم دو راتیں اور تین روز جدہ میں رہے۔

جس روز ہماری مکہ معظمہ واپسی تھی اور ہم بازار میں گھوم رہے تھے کہ ہمارے روم میٹ برادرم محسن کا فون آیا کہ ابھی آپ جدہ میں رہیں کیوں کہ ہماری فلائٹ delay ہو گئی ہے۔ اب یہ چار روز کی تاخیر سے جائے گی۔ یہ خبر بڑی پریشان کن تھی۔ پروگرام کے مطابق ۱۹ جنوری ۲۰۰۷ء کو ہماری صبح جدہ سے روانگی تھی اور ۲۱ جنوری کو کراچی سے بہاول پور کی ٹرین میں سیٹیں بھی بک تھیں ــــــ دوسرے ہمارے بچے بھی شدت سے انتظار کر رہے تھے۔

معجزے اب بھی ہوتے ہیں……

اس روز عشاء کے وقت ہم جدہ سے روانہ ہوئے اور تھوڑی ہی دیر میں حرم پہنچ گئے ہوٹل میں سامان رکھا' کھانا کھایا اور عبادت کے لیے حرم چلے گئے۔ حرم جا کر میں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی:

''یا اللہ! تو نے حج کی سعادت نصیب فرمائی' اتنے روز اپنا مہمان رکھا' ہر خواہش کا در کھول دیا' جو مانگا عطا ہوا' جو سوچا' وہ پایا…… ان نعمتوں کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے۔ اب معاملہ یہ آن پڑا ہے کہ ہماری روانگی وقت مقررہ پر نہیں ہو رہی بلکہ چار روز کی تاخیر ہوگئی ہے۔ دل بھی تیرا گھر چھوڑنے کو نہیں چاہتا' لیکن مجبوری ہے' چھٹی ختم ہو رہی ہے' بچے بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں۔ ان حالات میں' میں رکنا نہیں چاہتا' بلکہ اسی دن اسی تاریخ کو پاکستان جانا چاہتا ہوں۔ یا اللہ نبی پاک ﷺ کے صدقے اسی روز واپسی کا بندوبست فرما۔ اے اللہ تو دعائیں سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔ ہماری مدد فرما' مدد فرما''۔

ہم جب واپس آئے تو سب ساتھیوں کی زبان پر یہی تھا کہ اب تو چار دن بعد ہی روانہ ہوں گے۔ ہمارے گروپ لیڈر صدیق کھنڈ والی سے سب لوگ رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے' میں نے بھی ایک دو بار رابطہ کرنا چاہا لیکن بات نہ ہوسکی۔ رات کا ایک بج چکا تھا' میں سو گیا۔ فجر کی نماز پڑھ کر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہمارے گروپ

لیڈر اپنا سامان پیک کر رہے ہیں۔ میرے استفسار پر کہنے لگے' صبح چار بجے پی آئی اے آفس سے آیا ہوں۔ آپ لوگوں کے فون آ رہے تھے' لیکن اس وقت میں ایم ڈی سے میٹنگ کر رہا تھا' اس لیے فون اٹینڈ نہیں کیا۔ اب ہماری ۱۹ جنوری کی ہی سیٹیں کنفرم ہوگئی ہیں۔ ایک نیا جہاز پی آئی اے والوں نے چارٹر کیا ہے۔ روانگی کے وقت میں صرف ایک گھنٹے کا فرق ہوا ہے…… اب ہماری فلائٹ صبح سات بجے جائے گی۔ یہ خبر سنتے ہی خوشی کی لہر دوڑ گئی اور میں اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ شکر بجا لایا۔ سبحان اللہ' رب ذوالجلال کس طرح دعائیں قبول کرتا ہے اور کس طرح میزبانی کرتا ہے۔ اس کے بیان کے لیے الفاظ نہیں!

ظہر کی نماز کے بعد سے ہم نے اپنا سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا کیوں کہ ۱۸ جنوری بروز بدھ عشاء کے وقت ہمیں مکہ معظمہ سے جدہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ ۱۷ جنوری کی رات ہم دونوں میاں بیوی نے حرم میں گزاری۔ 'طواف وداع' ادا کیا اور حرم شریف کے مختلف حصوں میں گھومتے رہے' پھر فجر کی نماز پڑھ کے ہوٹل آئے' تھوڑی دیر آرام کیا پھر سامان کی پیکنگ شروع ہوگئی۔ ظہر کی نماز پڑھنے گیا تو ایک بار پھر طواف کی سعادت حاصل کی۔ عصر کے وقت بسیں آ گئیں' ہمارا سامان ان میں لادا گیا۔ مغرب کے بعد ہم نے اپنے ہوٹل 'برج العرب' کو الوداع کہا اور محلہ مسفلہ سے روانہ ہوگئے۔

تھوڑی دیر معلم کے دفتر پر بسیں رکیں اور پھر ہم جدہ روانہ ہوگئے۔ راستے میں گروپ لیڈر کی طرف سے جوسز کے پیکٹ اور کھانے کے پیکٹ دیے گئے اور یوں

دادا نے اپنا ایک خالی پیالہ اُسے دے دیا۔

"پالا بھی بہت ہے بیٹی۔ تمہارے پاس کوئی بستر ہے؟"

"جی نہیں، میرے پاس کوئی بستر بھی نہیں۔"

دادا نے اس ویران ہستی پر ہمدردی کی ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ وہ بھی بالکل اسی حالت میں یہاں آیا تھا۔

"باورچی خانے کے پاس کپڑوں کا دفتر ہے۔ کمبل مانگ لینا وہاں سے۔" پھر دادا نے ستاروں کو دیکھ کر وقت کا حساب لگایا۔ "نو بج رہے ہیں شاید سٹور بابو جاگتا ہو۔"

باورچی نے دلشاد کو دو روٹیاں اور پیالہ بھر دال دے دی۔ کپڑوں کے دفتر میں ایک مدھم سی لالٹین جل رہی تھی۔ خیمے میں رضائیوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ سُرخ سُرخ، بھورے بھورے، کالے کالے کمبلوں کی تہوں پر تہیں جمی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں گرم کپڑوں کے ڈھیر تھے۔ اونی سویٹر، پٹو کے کوٹ، گرم چادریں ——— سٹور بابو سرخ و سفید چھینٹ کی رضائی اوڑھے چارپائی پر لیٹا ہوا اقبال کا شکوہ گا رہا تھا:

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر   برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

جب اس نے دلشاد کو خیمے کے دروازے میں کھڑا ہوا پایا تو اس کے ترنم کی لے سُست پڑ گئی اور اس نے نہایت خشمگیں انداز سے دلشاد کو گھورا۔

"دفتر بند ہے جی اس وقت۔ صبح آٹھ بجے آنا۔"

"ہمارے پاس کوئی کپڑا نہیں ہے۔ ہم پالے سے مر جائیں گے۔"

"کوئی نہیں مرتے۔ صبح آٹھ بجے آنا، ہاں۔ دفتر بند ہے اس وقت۔"

دلشاد نے ایک بار پھر التجا کی۔ سٹور بابو جھنجھلا گیا۔

"میں کہتا ہوں چلی جاؤ سیدھی طرح۔ میں بھی آخر انسان ہوں مشین نہیں ہوں۔ ہاں صبح آٹھ بجے آنا۔" اور پھر وہ اپنے نرم و گرم لحاف میں سکڑ کر شکوہ گانے لگا —— آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر

اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

جوں جوں رات بھیگتی گئی، سردی میں اضافہ ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ یوں محسوس ہونے لگا جیسے ساری کائنات یخ بستہ ہو گئی ہو۔ سرد ہوا کے جھونکے تیر و نشتر کی طرح بدن میں لگتے تھے اور زمین کی نمی زہر آلود کانٹوں کی طرح جسم میں چبھتی تھی۔ دادا کے پاس ایک کمبل تھا۔ اس نے اسے آدھا نیچے بچھا کر محمود اور زبیدہ کو سلا دیا تھا اور آدھا کمبل اُن کے اوپر ڈال دیا تھا۔

وہ خود ایک پتلی سی چادر اوڑھے زمین پر لیٹا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس کے
دانت کٹ کٹ بج رہے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کو روئی کپڑے میں لپیٹ کر اپنے
سینے سے چپکائے بیٹھی تھی۔ کبھی وہ لیٹ جاتی تھی کبھی اُٹھ بیٹھتی تھی — کبھی
کھڑی ہو کر گھومنے لگتی تھی۔ لیکن ہر کروٹ، ہر پہلو سردی کا اثر سانپ کے
زہر کی طرح اس کی ہڈیوں میں سرسراتا ہوا بڑھ رہا تھا اور اسے ڈر لگتا تھا کہ
شاید اگلے لمحے وہ برف کے ٹکڑے کی طرح جم کر گر جائے گی۔

کچھ دور آگے ایک جوان عورت اپنے جسم کی گرمی ہر ممکن طریقے سے اپنی
چار سالہ لڑکی کے جسم میں منتقل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان کے پاس
بھی نہ کمبل تھا، نہ لحاف، نہ چادر۔ لڑکی کا سانس اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ اس کے
سینے میں گھنٹیاں سی بج رہی تھیں۔ جیسے بہت دور، افق کے پرے
اونٹوں کا ایک کارواں کسی جنت گم گشتہ کی تلاش میں چلا جا رہا ہو، چلا جا رہا ہو،
رواں رواں، رواں دواں ...... جیسے جیسے سردی بڑھتی گئی، لڑکی
کے سینے کی گھنٹیاں تیز تر ہوتی گئیں۔ اس کے سانس میں ایک زبردست تناؤ آگیا
جیسے زندگی اور موت کے فرشتے اس کے سانس کی لڑی تھام کر آپس میں
رسہ کشی کر رہے ہوں۔

اس کی ماں گھبرا گئی، بے بس ہو گئی، لاچار ہو گئی۔ اس نے کھڑے ہو کر گرد و پیش
کا جائزہ لیا۔ زمین پر اندھیرے کا سیاہ کفن چڑھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی چاند بھی اپنے
لحافوں کی اوٹ سے جھانک کر دیکھ لیتا تھا۔ چاروں طرف سکوت پا کر وہ عورت
سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس نے چوروں کی طرح دزدیدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا
اور ڈرتے ہوئے جھجکتے ہوئے، شرماتے شرماتے اس نے اپنے کپڑے کھول کر اپنی ٹھٹھرتی
ہوئی بچی کو ان میں لپیٹ لیا۔ اندھیرے میں ایک بجلی سی لہرائی اور اس جوان
عورت کا برہنہ جسم کائنات کے ذرّے ذرّے کو پکارنے لگا کہ دیکھو دیکھو آجاؤ
ساعت بیت نہ جائے۔ تم نے ارض و سما کے بہت سے راز دیکھے ہوں گے۔
لیکن تم اس ماں کے برہنہ جسم کو نہ بھول سکو گے جس کے کپڑوں میں اس کی
روتی ہوئی بیٹی لپٹی پڑی ہو اور بڑا سخت پالا پڑ رہا ہو اور سٹور میں گرم کمبل اور لحافوں
کے ڈھیر ہوں اور سٹور کا بابو رضائی میں لپٹا ہوا "شکوہ" گا رہا ہو اور —
— عورت کا عریاں جسم ایک غلیظ گالی بن کر چاروں طرف چھا گیا۔ رات
کی ظلمت میں رو سیاہی کی کالک اور بھی زیادہ گہری ہو گئی۔ آسمان پر جو ستارے
ٹمٹما رہے تھے آنکھیں موند کر بادلوں کی اوٹ میں چھپ گئے۔ چاند بھی اپنے
لحافوں کے بیچ سے جھانک کر یہ نظارہ دیکھنے کی تاب نہ لا سکا۔ ایک گھنگھور گھٹا

جو آسمان پر بے پروائی سے بکھری ہوئی تھی سمٹ سمٹ کر اکٹھی ہو گئی۔ اور بادلوں کی پلکوں سے موٹے موٹے آنسو گرنے لگے۔

ٹپ ٹپ ٹپ ——— ٹپ ٹپ پٹ ——— بوندیں برس رہی تھیں ٹھٹھری ہوئی ہوا کی ان سن سسکیوں کی طرح آہیں بھر رہی تھی۔ مہاجر خانے کے میدان میں زندگی کی ایک کمزور سی لہر جاگی، کچھ بچے روئے، کچھ عورتوں نے شور مچایا، کچھ مردوں نے ڈانٹ بتائی اور پھر ایک سناٹا چھا گیا۔

مینہ کی بوندیں دلشاد کے بدن میں بندوق کے چھرّوں کی طرح پیوست ہو رہی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے امریک سنگھ، ترلوک سنگھ، سورمکھ سنگھ، دلیر سنگھ کی کرپانیں اس کے جسم کو چھید رہی ہیں۔ بارش کا پانی قالین کے گرم ٹکڑے میں بھی نفوذ کر گیا اور اس میں لپٹی ہوئی ننھی سی جان سردی سے کپکپانے لگی۔ دلشاد نے سوچا کہ اگر وہ دادا سے پوچھ کر اپنی لڑکی کو محمود اور زبیدہ کے کمبل میں لٹا دے تو شاید اس غریب کی جان کو کچھ سہارا مل جائے۔ اس نے دادا کے گھٹنے کو ہلایا۔ وہ اپنی میلی سی چادر اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ دلشاد نے اُسے شانوں سے ہلایا، ہاتھوں سے ہلایا، گردن سے جھنجھوڑا، ہاتھ کھینچے، لیکن دادا کا خاکی جسم سردی اور گرمی کے احساس

سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ زندگی کا خون اس کی رگوں میں جم کے رک گیا تھا۔ اور اس کی ہڈیاں سردی سے اکڑ کر لوہے کی سلاخوں کی طرح تن گئی تھیں۔

جب صبح صادق کی پو پھٹی تو مہاجر خانے کے میدان میں ایک مرمریں مجسمہ چاندی کی طرح جھلملایا۔ یہ اس جوان عورت کا برہنہ جسم تھا جس نے اپنے کپڑوں میں اپنی مرتی ہوئی بچی کو لپیٹ لیا تھا۔ اس کے بے جان سینے سے اس کی بچی کی لاش یوں چمٹی ہوئی تھی جیسے ابھی ابھی دودھ پینے لگی ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے فن کار نے مرمر کو تراش کر یہ خوبصورت بت بنایا ہے۔ عورت کے کُٹے ہوئے دودھیا بدن پر بارش کے قطرے موتیوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ اس کی گھنی زلفیں کالے ناگوں کی طرح بکھری پڑی تھیں۔ اس کی نیم باز آنکھوں میں پانی کی ایک تہ سی جمی ہوئی تھی، جیسے اُس کے خون کے ساتھ ساتھ اس کے آنسو بھی منجمد ہو کے رہ گئے ہوں۔

مہاجر خانے کے کچھ منتظم کمبلوں کا پلندا اٹھا کر لے آئے۔ ایک کمبل انھوں نے دادا پر ڈال دیا۔ دوسرا عورت کے ننگے بدن پر، تیسرا اس کی بچی پر پھینکا۔ اور اسی طرح وہ میدان میں بکھری ہوئی لاشوں پر نرم نرم گرم گرم کمبلوں کے کفن ڈالتے گئے۔ جو لوگ زندہ تھے وہ حسرت بھری نگاہوں سے اپنے مردہ ساتھیوں کی طرف

دیکھتے تھے اور رشک کرتے تھے کہ اگر موت کے تصور میں ایک ان دیکھی ان جانی ان بجھی حقیقت کا خوف نہ ہوتا۔ تو وہ سب بخوشی و رغبت وہیں مر جاتے تاکہ مہاجر خانے کے بستر ان پر بھی اونی کمبل ڈالے جائیں۔ اور ان کے کپکپاتے ہوئے گوشت اور ٹھٹھرتی ہوئی ہڈیوں کو ذرا سا سکون، ذرا سی گرمی، ذرا سا آرام میسر آئے۔

محمود پوچھ رہا تھا کہ دادا کو وہ لوگ اٹھا کر کہاں لے گئے؟ زبیدہ نے سمجھائی تھی کہ دادا، ابا اور امی حج کرنے گئے ہیں — وہ کب آئیں گے؟ — وہ بہت جلد آجائیں گے، میرے محمود! وہ تو بس آتے ہی ہوں گے۔ ابا اور امی کہاں گئے ہیں؟ وہ تھوڑی دیر کے لیے اللہ میاں سے ملنے گئے ہیں وہ اس کے دربار سے تمہارے لیے عمدہ عمدہ کھلونے لائیں گے۔ شیشے کا لٹو، ربڑ کی گیند، چابی والی موٹر، نئے بوٹ، نئے دستانے، ٹوپی ——— محمود کا تخیل طرح طرح کے سوال ایجاد کرتا تھا۔ زبیدہ طرح طرح کے جواب گھڑ کر اسے تسلی دیتی تھی اور جب کبھی محمود ادھر ادھر کھیل میں لگ جاتا تو وہ نظر بچا کر منہ چھپا کر اپنے دل کا غبار نکال لیتی تھی۔

مہاجر خانے کی مشین بائیسکوپ کی طرح چل رہی تھی۔ صبح سے شام تک اس کے پردے پر بھانت بھانت کے سین آتے تھے اور نکل جاتے تھے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے   ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

بڑے بڑے دبدبے والے رئیس اور نواب آتے تھے۔ اونچی اونچی کرسیوں والے حکام آتے تھے۔ سرسراتے ہوئے ریشم و کمخواب میں ملبوس کلیوں کی طرح کھلے ہوئے حسن میں سرشار گلاب اور چنبیلی کے عطر میں حلی ہوئی بیگمات آتی تھیں وہ سب بچوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے تھے۔ عورتوں کے پاس کھڑے ہو کر ان کی اشک شوئی کرتے تھے۔ بوڑھوں اور جوانوں کی پیٹھ ٹھونک کر ان کی ٹوٹی ہوئی کمر کو سہارا دیتے تھے اور پھر سبکسار ہو کر یا انھیں مہاجر خانہ سے واپس لے جاتی تھیں۔ کوئی مٹھائی لاتا تھا، کوئی کپڑے بانٹتا تھا، کوئی پلاؤ اور قورمے کی دیگیں تقسیم کرتا تھا اور جب کوئی اس کار خیر میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا تو اس کے چہرے پر فخر و مسرت کی سرخی پھیل جاتی اور وہ دل ہی دل میں اپنے رحمان اور رحیم کا شکریہ ادا کرتا کہ اس نے اپنی قدرت کاملہ سے ایسے سامان پیدا کر دیے جن کے طفیل اس ناچیز کو بھی صدقہ و خیر خیرات کرنے کا موقع نصیب ہوا ——— دلشاد سوچتی تھی کہ جب کوئی جوان مرد محمود اور زبیدہ کا قصہ سنے گا تو سٹور بابو کو کان سے پکڑ کر کرسی سے اتار دے گا کہ اس نے اس کڑکے کی سردی میں بھی دادا کو صرف ایک

بھی کھل دیا۔ وہ ڈرتی تھی کہ جب کوئی رپد جے والے لطیفے والے بلند اقبال لوگ اس کی اپنی رام کہانی سنیں گے تو ان کا خون کھول اُٹھے گا۔ ان کی غیرت کو شدید چوٹ لگے گی۔ اور وہ اپنی بندوقیں اٹھا کر امریک سنگھ ترلوک سنگھ کرتار سنگھ دربار سنگھ کی تلاش میں چل نکلیں گے —— لیکن سننے والے سنتے گئے، سنانے والے سناتے گئے۔ دن میں مٹھائی اور پلاؤ بٹتا گیا رات کو رمضانی ہوا کی شمشیر اپنے وار کرتی گئی اور مہاجر خانہ کا بائیسکوپ بدستور چلتا گیا۔ ایک سین کے بعد دوسرا سین، دوسرے سین کے بعد تیسرا سین —— نہ آغاز نہ انجام، ایک مسلسل اور پیچیدہ "انعام" "ترحم" کہ جس میں انسان، انسان کا رازق بننے کے لیے بے قرار ہو، بے چین ہو اور اس بازی میں دوسروں پر سبقت لے جانے کے لیے ہر قسم کا داؤ ہر قسم کا پیچ کھیلنے پر تُلا ہوا ہو۔

ایک صاحب بڑے مخیر تھے۔ بدن پر خوشنما سوٹ، سر پر ترچھی ٹوپی، آنکھوں پر سونے کے فریم والی سبز عینک، اگلے دانتوں میں سنہری کیلیں، منہ میں پائپ، انگلیوں میں لعل اور یاقوت کی بیش بہا انگوٹھیاں —— وہ گھنٹوں مہاجر خانہ میں گھومتے تھے۔ ایک ایک کی داستان سنتے تھے۔ کسی کو پیسے دیتے تھے، کسی کو مٹھائی کی گولیاں، کسی کو چاکلیٹ —— دلشاد پر بھی ان کی خاص

نظرِ عنایت تھی۔ ایک روز وہ اس کی بچی کے لیے سرخ اون کا دیدہ زیب سویٹر لائے۔ دوسرے روز انھوں نے رحیم خان کی تلاش کرنے کا وعدہ فرمایا اور کچھ دنوں کے بعد وہ دلشاد کے لیے ایک جانفزا امید کا پیغام لے کر آئے کہ رحیم خان کا پتہ مل گیا ہے۔ بیچارا بے حد کمزور ہے۔ چلنے پھرنے سے معذور لیکن دلشاد کی یاد کے سہارے وہ ابھی تک بارِ زیست اٹھائے بیٹھا ہے۔ دلشاد کی نظر میں دنیا گلزار ہو گئی۔ مہاجر خانے کی زمین پر پھول ہی پھول اُگ آئے۔ اس کے بدن میں سلگنے والا زہر کافور کی طرح شکبار ہو گیا اور وہ اپنے دھڑکتے ہوئے سینے میں ارمانوں کا بے پناہ ہجوم چھپائے مسٹر مصطفےٰ خان سیمابی کی موٹر میں آ بیٹھی۔ کار فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ لاہور کی سڑکیں رنگین سانپوں کی طرح سرسرا رہی تھیں۔ یہ باغ جناح ہے، یہ گلستانِ فاطمہ کی چار دیواری ہے۔ یہ ملکہ معظمہ کا بت ہے۔ یہ مال روڈ کے رنگین ریستوران ہیں۔ یہ نیلا گنبد کا چوک ہے۔ اس گلی میں انارکلی کا مقبرہ ہے۔ یہ گرجا ہے، وہ مسجد ہے...... یہ مصطفےٰ خاں سیمابی کا مکلّف بنگلہ ہے۔ نوکروں کے کمرے میں گراموفون بج رہا ہے۔ "آج کرے جی بھر کے سنگار، تو بے جاتا ہے —— آج کرے جی بھر کے سنگار" دلشاد کا دل دھک دھک بج رہا تھا۔ اس دھک دھک میں ایک

ہو جیسے سرور کا ترنم تھا۔ وہ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے سوچ رہی تھی کہ شاید اس زمین پر رحیم خاں کے قدم پڑے ہوں۔ شاید اس بنگلہ کی ہوا میں اس کی دلاویز سانس بسی ہوئی ہو ـــ ۔ ۔ ۔ ۔ دلشاد کی نظر عقیدت میں بنگلے کی زمین کا ذرہ ذرہ مکہ اور مدینہ کی خاک بن گیا۔ بنگلہ کی اینٹ اینٹ پر مسجدوں کے مقدس منارے تعمیر ہو گئے ـــــــ ایک نوکر نے لا کے ایک پلیٹ میں پلاؤ ، ایک میں پالک اور گوشت ، ایک میں مٹر اور قیمہ ، ایک میں کیوڑے میں لگائی ہوئی فرنی لا کر رکھ دی۔ معلوم نہیں وہ کیا کیا کھا گئی اور کب کھا گئی ـــــ

ـــــ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی۔ اس کی روح اپنے رحیم خاں کے استقبال کے لیے سراپا انتظار بنی ہوئی تھی لیکن اس کے جسم کو ابھی تک کتے چچوڑ رہے تھے ـــ مصطفےٰ خاں سیمابی ڈریسنگ گاؤن پہنے اس کے سامنے بھیڑیے کی طرح منڈلا رہا تھا۔ میز پہ سکاچ وسکی کی بوتل جگمگا رہی تھی۔ وہ اپنی بانہیں پھیلا پھیلا کر کہتا تھا کہ میری جان ! آ کر میرے سینے سے لگ جاؤ۔ تم بڑی مظلوم ہو ـــ تم بڑی غریب ہو لیکن میں ایک امیر انسان ہوں میں کچھ روز کے لیے تمہیں ملکہ بنا کے رکھوں گا۔ تمہارا رحیم خاں معلوم نہیں کہاں کھو گیا۔ شاید وہ کسی ویرانے میں مرا پڑا ہو۔ لیکن تم اس فرضی ہستی

کی یاد میں اپنی جوانی نہ گنواؤ ! میری جان آؤ ، میرے سینے سے لگ جاؤ اب تم اپنے آزاد وطن میں آ گئی ہو ـــ اب تمہیں کسی بات کا ڈر نہیں ، یہ ہمارا وطن ہے ـــ یہ ہمارا آزاد وطن ہے ۔ پاکستان زندہ باد ! پاکستان پائندہ باد !!

ـــــــــ دلشاد کے گلے میں مولا علی بخش کی تسبیح لٹک رہی تھی ۔ جب مصطفےٰ خاں سیمابی کی زبان لپک لپک کر تسبیح کے دانوں کو چومتی تو دلشاد کو یہ محسوس ہوتا کہ ایک مسلمان بھائی سنگ اسود کو بوسہ دے رہا ہے ـــــــــ

دو چار دن میں جب مصطفےٰ خاں سیمابی نے اپنے حج کے ارکان پورے کر لیے تو دلشاد پھر مہاجر خانے واپس آ گئی۔ ننھا محمود شیشے کا لٹو چلا رہا تھا۔ اس نے تتلا تتلا کر "تالیاں بجا بجا کر دلشاد کو سمجھایا کہ زبیدہ باجی بھی موٹر میں بیٹھ کر دادا میاں کے پاس گئی تھی ـــ دادا میاں نے شیشے کا یہ لٹو بھیجا ہے۔ یہ ربڑ کی گیند ، یہ رنگ دار مٹھائی ، آج وہ پھر موٹر میں بیٹھ کر دادا میاں کے پاس گئی ہے۔ موٹر پوں پوں کرتی جا رہی ہے۔ اب وہ پھر دادا میاں سے پیسے لائے گی۔ نئے نئے بوٹ لائے گی ـــ تلے دار ٹوپی لائے گی ـــــــ

کراچی

دلشاد نے کھڑکی سے منہ نکال کر دیکھا۔ صدر کے اسٹیشن پر گہما گہمی تھی ریفیوجی سپیشل کی مخلوق گاڑی سے نکل نکل کر پلیٹ فارم پر جمع ہو رہی تھی۔ سارا سٹیشن کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ بادلوں کی طرح چھٹ گئی۔ پلیٹ فارم پر کچھ قلی، کچھ باہر جانے والے مسافر اور کچھ ٹکٹ چیکر باقی رہ گئے۔ آن کی آن میں ریفیوجیوں کا جمِ غفیر بے مایہ قطروں کی طرح کراچی کے بحرِ بے کراں میں غرق ہو گیا، جیسے سمندر کی تیز و تند لہر ساحل کے خس و خاشاک کو اپنے ترنّم میں بہالے جانے یا جیسے سورج کی کرنیں

شبنم کے موتیوں کو اپنے دامن میں چھپا لیں یا جیسے شراب کا نشہ دل کے گوشے میں لرزندہ اندیشوں کو اپنے خمار کی آغوش میں سلا دے یا جیسے کسی گھٹی ہوئی، مرتی ہوئی سانس کو تعفن گلاب اور موتیے کی شمیم کو اپنے سینے کے اندر جذب کر لے'

سوڈا آئی لینڈ تیز تیز قمقموں کی روشنی میں جگمگ کر رہا ہے — کلفٹن بیچ چودھویں رات کی چاندنی میں نہایا ہوا ہے۔ سمندر کی لہریں ساحل کو چھیڑ چھیڑ کر ایک مدہوش سا رباب بجا رہی ہیں۔ لہروں کا پانی ریتیلے ٹیلوں سے ٹکرا کر فضا میں نقرئی فواروں کی طرح جھلملا رہا ہے۔ ہوا میں ایک نازک سی خنکی ایک نرم سی ملائمت ہے۔ زندگی کی ایک میٹھی سی تڑپ بیچ پر مخمور سانپوں کی طرح لہرا رہی ہے۔

چار جوان وسکی کے جام بھر کر سوڈا ملا رہے ہیں۔ "ہائے ہائے دلّی!" ایک نے سینے پر ہاتھ مار کے آہ بھری۔

"سواد روضۃ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے۔ ہائے ری دلّی" دوسرے نے واویلا کیا۔

"کون جائے ذوق یہ دلّی کی گلیاں چھوڑ کر ———

ہائے دلّی، تیری خاک پاک کی کشش" تیسرا رانوں پر تھپڑ مار مار کے ماتم کرنے لگا۔

چوتھا جوان سنجیدہ رہا۔ وہ وسکی کا جام ہونٹوں سے چپکائے مراقبے میں گیا ہوا تھا۔ جب اس کے ساتھیوں نے ذرا زور شور سے دلّی کی نوحہ خوانی شروع کی، تو وہ چونکا ——— "ایں؟ یہ تو وہی سالی کراچی رہی۔ واللہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ چاوڑی بازار میں چہل پہل ہے۔ بی چاند جان کا بالا خانہ ہے اور وہ ساقی مہوش اپنی حنائی انگلیوں میں ساغر اٹھائے آ رہا ہے' لا رہا ہے' آ رہا ہے' لا رہا ہے —

ہائے ہائے دلّی! ہائے ہائے دلّی! ہائے بی چاند جان' ہائے بی چاند جان ——— وہ چاروں ایک فصیح و بلیغ مرثیے کی دھن میں کھو گئے اور ٹھنڈی ریت پر لوٹ لوٹ کر اپنی جنت گم کردہ کا ماتم کرنے لگے

کچھ دور پرے ایک متقطع و متشرع بزرگ پان چبا رہے تھے۔

ان کے آگے چند عقیدت مند دو زانو بیٹھے تھے۔

"دلّی گئی، دلّی والے گئے، سب کچھ گیا لیکن کچھ نہ گیا

پان لاؤ" بزرگ نے فرمایا۔

اُن کی خدمت میں پان پیش کیا گیا۔

"تباکو تو اچھا ہے بھئی" — بزرگ نے رائے دی: "کہاں سے لائے ؟"

کسی نے عرض کیا" ۲۹ روپے سیر ہے، لکھنؤ سے منگوایا تھا۔

"ہاں" تو میں کہہ رہا تھا کہ دلی گئی"۔ بزرگ نے اپنی ٹوٹی ہوئی تان کو از سرِ نو پکڑا۔ "دلی دلّی ہی کے سلسلے میں کیوں ؟ جانتے ہو بھلا کیوں ؟"

عقیدت مند سوچنے لگے کہ کیوں ؟ ان کے چہروں پر کیوں کی سوالیہ علامت شبیہ بن کر لگ گئی۔

بزرگ نے خود ہی جواب دیا" وہ لال قلعہ۔ وہ جامع مسجد، وہ قطب مینار وہ قبریں جن میں بزرگوں کی خاک دو بول دُعا سننے کے لیے ترس رہی ہے۔ غالب کا مزار، شیخ المشائخ حضرت نظام الدین اولیا، کا مرقد نور ——— ——— سب چلے گئے۔ سب ہاتھوں سے نکل گئے۔ تم لوگ کہتے اپنے نصیب، میں کہتا ہوں اپنے اعمال، ہمارے اپنے ناگفتہ بہ اعمال۔ میں تم کو بتاتا ہوں تقدیر اُمم کیا ہے ؟ ——————— —— پان لاؤ"

پان حاضر کیا گیا۔

"میں تم کو بتاتا ہوں تقدیر اُمم کیا ہے   شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر"

"دعوت تیرے کی : ڈسکو والی پارٹی کا ایک جوان اپنے ساتھی پر گرج رہا تھا۔ "چاند جان میری تھی، وہ مجھ پر عاشق تھی۔ وہ تیرے منہ پر تھوکتی بھی نہ تھی ——— اں ——————"

دوسرا جوان سوڈے کی بوتلیں اور خالی گلاس جمع کرکے ایک عملی سا جواب دینے کی تیاری کر رہا تھا۔

ان کے باقی دو ساتھی ایک دوسرے کے سر پر اُلٹا کھڑے ہونے کی مشق فرما رہے تھے۔ ایک پارسی لڑکی ان کی حرکات پہ قہقہے لگا کر فضا میں ایک لذیذ سا ترنم، ایک پیارا سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ اس نے نہانے کا رنگین لباس پہنا ہوا تھا۔ اس بیدنگ کاسٹیوم میں اس کا چھریرا بدن قوس کی طرح تنا ہوا تھا ——————— بزرگ فرما رہے تھے ——— پان لاؤ

جیت کورٹ اور اسمبلی ہال کے درمیان جہاں تا گاندھی کا بت پہرے پر چوکس کھڑا ہے کہ کہیں انصاف اور سیاست ایک دوسرے کے قریب نہ آنے پائیں۔ دو سائیکل سوار ٹھہر کر اس کا جائزہ لینے لگے۔ ایک نے اس کی لاٹھی چھیننے کی کوشش کی، دوسرے نے اس کی عینک کو اڑانا چاہا۔ جب

وہ دونوں اس کوشش میں ناکام ہوئے تو ایک نے اپنی سرخ ترکی ٹوپی اتار کر بت کے سر پر رکھ دی اور وہ خوش خوش وہاں سے چل دیے کہ انھوں نے چپکے چپکے اس بت کو مسلمان کر لیا۔

ایک ہندو خاندان ہجرت کر رہا تھا۔ ان کی خوشنما کوٹھی کے سامنے چار اونٹ گاڑیاں سامان سے لدی کھڑی ہیں۔ لوہے کے ٹرنک، چمڑے کے سوٹ کیس، لکڑی کی پیٹیاں ——— سامان میں ایک طوطے کا پنجرہ بھی ہے۔ طوطا مرچ کی پھلیاں کھا رہا ہے۔ جب کوئی اس کے پاس سے گزرتا ہے، تو وہ نیم باز آنکھوں سے اس کی طرف یوں دیکھتا ہے گویا کہہ رہا ہو کہ لو سالو! میں بھی چلا ——— اب میں دیکھوں گا تم اپنا پاکستان کیسے بناتے ہو ——— ؟

قصر ہوٹل کی رقص گاہ میں آرکسٹرا بج رہا ہے۔ ہوٹل کے مینیجر نے سٹیج پر آ کے اعلان کیا کہ آج رات کی نصف آمدنی قائدِ اعظم ریلیف فنڈ میں دی جائے گی، لوگوں نے گرم جوشی سے تالیاں بجائیں۔

"میرا جی کراچی سے اُکتا گیا ہے" ایک دیدہ زیب بیگم نے شیری کا گلاس لب لعلین سے لگا کر کہا "چلو ڈیئر کچھ روز کے لیے بمبئی گھوم آئیں۔"

اس کا ساتھی شیمپین پی رہا تھا "اب تو بمبئی بھی مرحوم ہو گئی بیگم ——— سالی کانگریس اس پیرس صغری کو ڈاہب خانہ بنانے پر تلی ہوئی ہے، نہ وسکی، نہ شیری، نہ جن نہ شیمپین ——— اب سنتا ہوں کہ ریس پر بھی بندش لگانے کی سازش ہو رہی ہے"

"ارے ہاں" بیگم کو یکا یکی یاد آیا "ابھی اگلے روز پروفیسر محتشام کا خط آیا تھا۔ پروہیشن کے ہاتھوں بے چارہ مجبور ہو گیا ہے۔ ایک کیس وسکی منگوائی ہے، کسی طرح بھجوا دو، ڈیئر۔"

ایک غیر ملکی سفیر کا سیکرٹری دوسرے غیر ملکی سفیر کے سیکرٹری سے سرگوشی کر رہا تھا "مجھے کراچی میں دو چیزیں بہت پسند ہیں"

"مجھے تین" دوسرے نے کہا

"پارسی لڑکیاں، اور مسلمان عورتوں کے برقعے"

"مجھے برقعے والیاں بھی پسند ہیں"

"واللہ بڑے کورذوق ہو۔ ان مدقوق عورتوں کو کون چاہے گا بھلا؟"

"انھیں میں چاہتا ہوں۔ یسوع مسیح کی قسم، مجھے یہ بیمار حسن پسند ہے۔ پیلے پیلے گالوں میں نیلی نیلی رگوں کی لکیریں، اس پر غازے کا غبار —— خزاں کے موسم میں گلاب کی پتیاں —— ہائے میں نے ایسا حسین امتزاج کہیں نہیں دیکھا —— بولئے دو سوڈا دو وسکی۔"

"ایک ہی بات ہے تم چلاؤ یا میں چلاؤں —— ہمارے دونوں ملکوں کا نصب العین مشترک ہے۔ ہم اس اشتراک کو مستقل بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے —— تمھاری صحت کے لیے۔"

ایک مسلمان ایڈیٹر لیمن سکوائش سے جی بہلا رہا تھا۔ موقع پاکر وہ شراب اور کپڑے کے ایک بڑے تاجر کو گھیر کر کھڑا ہو گیا۔

"میں نے سنا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد کراچی اور لاہور میں ولایتی شراب کی کھپت پہلے سے دگنی ہو گئی ہے؟" ایڈیٹر نے اپنے ایڈیٹوریل کے لیے مواد اکٹھا کرنا شروع کیا۔

"غلط" تاجر نے گرمجوشی سے تردید کی۔ "بالکل غلط، آپ بھی کیسا عجیب افواہیں سے اڑتے ہیں۔ دگنی تو کیا اگر دگنی بھی ہو جائے تو غنیمت ہے۔"

"افسوس" ایڈیٹر نے اصرار کیا۔ "کیا یہ امر اس نئی اسلامی حکومت

کے لیے شرمناک نہیں؟"

"پاکستان دنیا کا پانچواں بڑا اور مسلم عالم میں سب سے بڑا ملک ہے۔" تاجر نے ایڈیٹر صاحب کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔

"کیا یہ امر اس سب سے بڑے مسلم ملک کے لیے شرمناک نہیں؟"

ایڈیٹر صاحب برابر مصر تھے۔

"قبلہ" تاجر نے وسکی کا لمبا سا گھونٹ بھر کر کہا۔ "آپ ریاست بنا رہے ہیں، مسجد نہیں ——"

"وہ کالے کالے برقعے" دوسرے غیر ملکی سفیر کا سیکرٹری پہلے غیر ملکی سفیر کے سیکرٹری سے کہہ رہا تھا۔ "سرخ و سبز ریشم کے سرسراتے ہوئے نقاب، برقعوں کی اوٹ میں جھانکتے ہوئے گول گول، پیلے پیلے، لال لال چہرے، سڈول باہیں، ریشم کی تہوں سے جھلکتے ہوئے مخروطی ہاتھ —— کنواری مریم کی عصمت کی قسم، میں نے ایسے برقعے کہیں نہیں دیکھے۔ جب میں انھیں الفنسٹن سٹریٹ کی دکانوں میں بجلیاں گراتے دیکھتا ہوں، یا گاندھی گارڈن کے سبزے پر اٹھکیلیاں کرتے ہوئے پاتا ہوں، تو میرا جی بے اختیار چاہتا ہے کہ میں ان کے قدموں میں گر جاؤں

اور اُن کے نازک اور سُبک پاؤں مجھے اپنی ٹھوکروں سے روندتے چلے جائیں روندتے چلے جائیں ۔۔ ———

"بولتے دو پگ وسکی اور سوڈا" پٹھان نے آواز دی۔

"اس بار میری طرف سے۔ بولئے: دو سوڈا، دو وسکی" دوسرے نے کہا۔

"ایک ہی بات ہے، تم پلاؤ یا میں پلاؤں — ہمارے بہادر ملکوں کا نصب العین ایک ہی ہے۔ ہم پاکستان کے خانہ بدوش مہاجرین کی یکساں مدد کریں گے۔"

"یہ دونّی کھوٹی ہے جی" بس کے کنڈکٹر نے کرختگی سے کہا۔ "اسے بدل دو۔"

"یہ دونّی میں نے نہیں بنائی" پنجابی پسنجر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "میں یہ دونّی کوئی دِلّی یا لکھنؤ سے نہیں لایا۔ میں تمہیں ہرگز دوسری دونّی نہ دوں گا۔"

کنڈکٹر نے بس روک دی۔ "جب تک تم مجھے دوسری دونّی نہ دوگے

یہ بس آگے نہیں جائے گی۔"

کچھ پنجابیوں نے کنڈکٹر کو چند فصیح و بلیغ گالیاں دیں۔ "سالے سندھی، مفت کا پاکستان مل گیا سالوں کو، ہم بھی دو دن میں مزاج ٹھکانے لگا دیں گے، ہاں۔"

کنڈکٹر اور ڈرائیور باہر نکل کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ "سالے پنجابی، پٹ پٹا کر یہاں آئے تو سالوں کا دماغ ہی نہیں ملتا۔ سر پہ ہی چڑھے آتے ہیں، سوّر کے بچے، جیسے ان کی ماں کے خصم کا گھر ہے یہاں۔"

ایک ہندو راہگیر یہ قصیدہ سن کر ٹھہر گیا اور داد کے طور پر اس نے کنڈکٹر اور ڈرائیور کو ایک ایک بیڑی پیش کی۔

دو بنگالی یہ ہنگامہ دیکھ کر بس سے نیچے اتر آئے۔

"لارنس روڈ کتنی دور ہے جی؟" ایک نے پوچھا

"یہی کوئی دو فرلانگ اور ہوگی" دوسرے نے اندازہ لگایا۔

"آؤ ٹہلتے ہی چلیں۔"

جب وہ دونوں بس سے ایک محفوظ فاصلے پر پہنچ گئے تو انھوں نے دونّی والے حادثے پر جی کھول کر تبصرہ کیا۔ "لڑنے دو، سالے سندھیوں

اور پنجابیوں کو کہتے ہیں پاکستان کی زبان اردو ہوگی۔ چھی! گویا شہر تو بنگلا بھاشا ہماری قومی زبان ہی نہیں... چھی ———

صدر کے چوک میں ایک ایرانی ہوٹل والا ایک چھابڑی والے پر گرج رہا تھا۔ "تم یہ گندے کیلے یہاں نہیں رکھ سکتے۔ میرے ہوٹل میں مکھیاں آتی ہیں ——— ہاں"

"لے چل۔ ہوٹل کے بچے" چھابڑی والا اکڑ رہا تھا۔ "یہ پٹڑی تیرے باوا کی ہے؟"

ایرانی نژاد ہوٹل والے نے پاؤں کی ایک بھرپور ٹھوکر سے کیلوں کی چھابڑی الٹ دی۔ چھابڑی والا لپک کر اس کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔

ایک کانسٹیبل نے آکر چھابڑی والے کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا "سالے حرامی کتنی بار کہا ہے یہاں بکری مت کرو لیکن سنتے ہی نہیں حرامزادے چلو تھانے چلو"

چھابڑی والے نے گڑگڑا کر خوشامد کی "کدار و فرجی میں اجمیر شریف سے آیا ہوں۔ میرا گھر بار سب لٹ گیا ہے۔ میری اندھی بہن میرے ساتھ

ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں پھر یہاں چھابڑی نہیں لگاؤں گا۔

لیکن قانون قانون ہے۔ قانون کی نظر میں نہ اجمیری کا امتیاز ہے نہ لاہوری کا۔ نہ اندھی بہن کی تمیز ہے۔ نہ آنکھوں والی کی۔ کانسٹیبل نے اپنا فرض منصبی بڑے احسن طور پر انجام دیا اور چھابڑی والے کو آگے لگا کر تھانے لے گیا ——— جب تھانیدار نے اندھی بہن کی تفصیل سنی تو اسے کانسٹیبل کی نالائقی پر بڑا غصہ آیا کہ کیوں نہ وہ اس کی اندھی بہن کو بھی ساتھ ہی لیتا آیا ———

"دو اور دو چار ——— چار اور تین سات ——— سات اور نو کے ہوئے؟" چیلا رام دلال نے خوشی محمد دلال سے پوچھا

خوشی محمد دلال چائے سے مکھی نکال کر چمچہ چھٹک رہا تھا۔ ادھ مری مکھی کو فرش پر گرا کے اس نے چائے کا ایک لمبا سا گھونٹ بھرا۔

"سات اور نو سولہ" چیلا رام نے خود ہی حساب لگایا۔ "میں نے کہا استاد، سیزن برا نہیں رہا۔"

خوشی محمد دلال نے اپنا لٹکا ہوا نچلا ہونٹ سمیٹ کر چائے کا ایک اور

لیا سا گھونٹ لیا۔

"سچ پوچھو دوست تو بڑا کرارا سیزن لگا تھا" چیلا رام کے گالوں کی لکوریاں خوشی سے پھیل رہی تھیں۔ "ایک سیزن میں سولہ چھوکریاں! رام قسم میں نے تو ایسا دھندا ساری عمر نہیں کیا تھا"

اطمینانِ قلب کے اظہار کے طور پر چیلا رام نے چاند تارے والی جناح کیپ اتار کر اپنی گنجی چندیا کو زور زور سے سہلایا۔

خوش محمد کا لٹکا ہوا نچلا ہونٹ اور بھی لٹک گیا۔ اور ردِّ عمل کے طور پر اس نے چائے کا ایک طویل سا گھونٹ سڑاپ لیا۔

"تم سالے قسمت کے دھنی ہو" خوش محمد منمنایا۔ "چھوکری پر چھوکری اڑا دیتے تھے۔ یہاں مشکل سے صرف تین ہاتھ آئیں"

"تین چھوکریاں! تھو!!" چیلا رام نے طنزاً ریستوران کے فرش پر بلغم کا ایک بڑا سا لقمہ تھوک دیا۔ "کمال کا کی پوچھنے نہیں۔ کوئی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھتا تھا تھو ———— میرے پاس بڑے انمول دانے تھے یار... گرم گرم سخت سخت پنجابیں۔ نازک لچکدار دلی والیاں اور پھر وہ پٹیالے والی جٹنی۔ ہائے ہائے میرا تھی' خوش محمد میرا!"

چیلا رام نے ایک کھارا بسکٹ انگلیوں کے درمیان دبا کر توڑ ڈالا۔

"وہ سالا براؤن اسے پورٹ سعید لے گیا۔ کہتا تھا' بڑا کام دے گی وہاں ———— میں نے کہا خوش محمد' یہ پورٹ سعید کس طرف ہے؟"

"ہوگی کہیں" خوش محمد کا بیوپار ذرا مندا تھا۔ "چائے منگواؤ اب تو کوئی سالی ریفیوجی ٹرین بھی نہیں آتی"

گرم چائے کے دوسرے کپ پر وہ دونوں پھر اپنے اپنے خیالوں کی دنیا میں کھو گئے۔ چیلا رام دلال اپنے انمول دانوں کا حساب لگا رہا تھا۔ جو اس کے اپنے ہاتھوں سے نکل کر روئے زمین کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ قاہرہ ———— لندن ———— پورٹ سعید ———— نہ جانے اس کے بیش قیمت تحفے کس کس شبستان کی زینت بنے ہوئے تھے کسی دلکش آرامگاہ میں اس پٹیالے والی جٹنی کا جسم بھی ریشم اور کمخواب کے گاؤ تکیے کی طرح سجا ہوا ہوگا ———— چیلا رام کے دل میں عجیب عجیب قسم کی آرزوئیں سر اٹھا رہی تھیں۔ ایک بار اس کا جی چاہا' کہ وہ پر لگا کر پورٹ سعید جا پہنچے اور پانچ سو ستر روپے کے نوٹ سالے براؤن کے منہ پر مار کے پٹیالے کی جٹنی کو واپس لے لے اور اس کے گچھے ہوتے

ملیں کا ڈھکنے اپنے جسم کو ہاتھوں پر اٹھا کر بھاگ آتے، طوفانوں سے لڑتا ہوا، سمندر کی لہروں سے ٹکراتا ہوا پہاڑوں کی چھاتی کو چیرتا ہوا ـــــ

خوشی محمد دلال کی دنیا میں غم اور غصے کا دھواں چھایا ہوا تھا۔ پہلے تو یہ سارے ریفیوجی ہوائی جہازوں میں بھر بھر کر لائے جاتے تھے۔ ٹرینوں پر ٹرینیں لدی آتی تھیں ـــــ لیکن اب کچھ دنوں سے بازار سرد تھا۔ وہ ہر روز اخباروں میں نئی نئی خبریں پڑھتا تھا ـــــ دلی میں خون ـــــ کانپور میں خون ـــــ کلکتے میں خون ـــــ احمد آباد میں خون ـــــ اجمیر میں خون ـــــ لیکن اس سارے خون کے بدلے میں ایک ریفیوجی ٹرین بھی کراچی نہ پہنچتی تھی۔ خوشی محمد دلال کو اس بات کا سخت قلق تھا۔ پھر بھی اس نے کسی موہوم سی امید کا سہارا لے کر کچھ پیسے کا خرچ کیا اور اخبار کی سب خبروں پر چھپائی ہوئی نظر دوڑائی۔ اخبار بیچنے والا چھوکرا گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا "اب تو کشمیر میں بھی چھڑ گئی ـــــ جموں میں لاکھوں مسلمانوں کا خون ہو گیا ـــــ اب تو ـــــ"

خوشی محمد دلال نے ہمہ تن غرق ہو کر خبریں پڑھیں۔ کشمیر کی جنت میں بھی دوزخ کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ زعفران کے کھیتوں پر آگ برس رہی تھی۔

پھولوں کے دامن میں شرر رقص کر رہے تھے۔ نسیم بہار کی جگہ زرد گردوں کی تلوار چل رہی تھی۔ ہزاروں مر گئے تھے، ہزاروں مر رہے تھے، ہزاروں مینڈکوں کی طرح چھپ چھپ کر، چوہوں کی طرح رینگ رینگ کر اس آتشکدہ جہنم سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

خوشی محمد نے چیلا رام کی ران پر زور سے ہاتھ مارا۔ "اب تو کشمیر میں بھی لگ گئی میرے یار۔ میں نے کہا چیلا رام، ذرا سن تو"

چیلا رام پورٹ سعید کے تصور میں گم تھا۔ "پھر تو سیب مہنگے ہو جائیں گے؟" اس نے بے توجہی سے پوچھا۔

لیکن خوشی محمد میں شاعری کی روح حلول کر گئی تھی۔ اس نے چٹخارے لے لے کر کشمیر کی نازک بدن، سیم تن عورتوں کا ذکر سنایا۔ خوبصورت رنگین معصوم عورتیں ـــــ جن کے گالوں میں سیب ہوتے ہیں۔ چھاتی پر ناشپاتیاں۔ ہونٹوں پر انگور کا رس۔ آنکھوں میں ڈل کی لہروں پر رقصندہ کنول۔ گلے میں پہاڑی جھرنوں کا سرور۔ انگ انگ میں گلاب اور موتیے کی رنگت۔ زعفران کی بھینی بھینی مہک ـــــ

چیلا رام دلال کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ وہ آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا اور

خوش محمد کے پیسے اس نے چائے کا تیسرا کپ بھی منگوایا۔ پھر وہ سر سے سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور کشمیر کے سیزن کی امید افزا رعنائیوں میں کھو گئے ۔۔۔

ہوا کے تھپیڑوں سے بادباں لہرایا۔ موجوں میں ایک ہلکا سا تلاطم اٹھا ۔۔۔ کشتی ڈگمگائی اور وہ سہم کر سیٹھ قائم علی دائم علی کے پہلو سے لگ گئی۔

سیٹھ قائم علی دائم علی کی توند میں ہنسی کا جوار بھاٹا سا اُٹھا اور پان کی پیک جو کچھ عرصے سے اُن کے منہ میں جمع ہو رہی تھی بے اختیار بدرو کے گندے پانی کی طرح بہ نکلی۔

بوڑھا ملاح بیڑی سلگا کر مسکرایا: "کشمیر سے آئی ہے سیٹھ، اندھی ہے بچاری، ابھی ڈرتی ہے۔ بولو، کس طرف چلوں؟ پیرس یا ونیس؟"

سیٹھ قائم علی دائم علی کا ایک دفتر پیرس میں بھی تھا۔ یوں بھی اس نے پیرس کے متعلق بڑی دلاویز باتیں سُن رکھی تھیں لیکن اس وقت وہ اس چھوٹی سی ڈگمگاتی ہوئی کشتی میں اتنے لمبے سفر پر جانے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ چنانچہ جب ملاح نے اسے پیرس یا ونیس چلنے کی دعوت دی تو وہ بوکھلا گیا۔

چالاک ملاح اس کی بوکھلاہٹ پر مسکرایا: "گھبراؤ نہیں سیٹھ، دور نہیں

سے جاؤں گا۔ ہا! کیا جگہ ہے پیرس بھی! دیکھو گے تو مر جاؤ گے! ہا!"

کیماڑی کی بندرگاہ میں خاصی چہل پہل تھی۔ اتوار کی چھٹی منانے والے ہجوم اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ کوئی منوڑا جا رہا تھا، کوئی سینڈز پٹ آ رہا تھا ۔۔۔ اور ایک جہاز بمبئی جانے کے لیے لنگر اٹھا رہا تھا۔ جہاز کے ڈیک پر سینکڑوں رنگین ساڑھیاں پھڑپھڑا رہی تھیں۔ لوگ دوربینیں آنکھوں سے لگائے کراچی کی آخری جھلک دیکھ رہے تھے۔ جب جہاز روانہ ہوا، تو کچھ لوگوں نے اپنے سروں سے جناح ٹوپیاں اتار کر سمندر میں پھینک دیں اور ہوا میں گھونسے لہرا لہرا کر "جے ہند" کا نعرہ لگایا۔

کشمیر کی اندھی دوشیزہ سیٹھ قائم علی دائم علی کے پہلو سے لگی ایک گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب لہروں کے تلاطم پر کشتی کا سینہ ڈگمگاتا تو اسے اپنا ہلکا پھلکا شکارا یاد آتا، جو اسی طرح ڈل اور وولر کی نازک لہروں پر تھرتھرایا کرتا تھا۔ پہلے دن جب اس نے سمندر کا چلو بھر پانی پیا تو اُسے قے آ گئی ۔۔۔ ۔۔۔ اُف! کتنا کڑوا پانی تھا۔ ڈل کا پانی تو تازہ دودھ کی طرح میٹھا تھا اور چشمہ شاہی کا پانی ۔ ہائے جیسے دودھ اور مکھن اور شہد کو برف میں لگا کر پیا جائے۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک بار اس کڑوی جھیل کو بھی دیکھے کہ اس کا پانی کالا ہے یا سرخ؟

نیلا ہے یا سبز؟ لیکن اسے اس کی آنکھیں! ایک دن تھا کہ اس کی خلاق آنکھوں میں جھیل ڈل کی لطیف نیلاہٹ اور پکے باداموں کی نازک راحت ہوا کرتی تھی لیکن اب ان کی جگہ گہرے گہرے زخم تھے۔ جیسے دو اندھے اور تاریک کنویں کسی دور دراز ویرانے میں کھودے پڑے ہوں ——— اب وہ اندھی تھی' بے بصر تھی' ایک جابر ڈوگرے نے اپنی سنگین سے اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے طلسمی رنگ کو نکال کر دیئے تھے'

ساحل کے ہنگامے سے دور' ایک کالے رنگ کا جہاز سمندر میں تنہا کھڑا تھا اس پر سرخ رنگ کے جلی حروف میں لکھا تھا کہ اس میں بارود ہے۔ جب اس کی کشتی پاس سے گزری تو سیٹھ تاتم علی داتم علی نے جلدی سے لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ معاً اسے ڈر لگا کہ کہیں یہ بارود بھک سے اڑ نہ جائے ——— جب کشتی ذرا دور نکل گئی تو سیٹھ تاتم علی داتم علی نے پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی توند پر رکھ لیے۔

کشتی ایک چھوٹے سے جزیرے سے جا لگی۔ جزیرے میں چند ماہی گیروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ ملاح نے بتایا کہ اس عشرت کدے کا نام پیرس ہے۔ آس پاس اور بھی چند جزیرے تھے' ان کے ساحلوں پر بھی اکا دکا کشتیاں کھڑی تھیں۔

کہیں وینس تھا' کہیں نیپلز ——— کہیں روم ———!

ملاح نے بادبان کھول کر کشتی پر اک سائبان سا تان دیا۔ پھر اس نے سیٹھ

تاتم علی داتم علی کو آنکھ ماری: "لو سیٹھ' میں تو مچھلیاں پکڑنے چلا ——— تم مزے سے کشمیر کی بہاریں لوٹو ———"

عیدگاہ کے میدان میں ایک نیا بازار لگا ہوا ہے۔ جہاں ہر روز عید ہے ہر شب' شب برات! ٹاٹ کی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں ننھے ننھے چراغ ٹمٹما رہے ہیں۔ گوشت روٹی' جلے ہوئے کپڑے' پرانے بوٹ' تازے پھل' لوہے کی مینخیں' لکڑی کے صندوق' چمڑے کی کرسیاں' تیل' اچار' صابن ——— بے گھر اور بے در مہاجر سہارے کی ہر ممکن لڑی تھام کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک عجیب قسم کا اطمینان' ایک عجیب قسم کی ابدیت اس ماحول پر جاری و ساری ہے ——— جسے دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ زندگی کا یہ بھٹکا ہوا کارواں آخر اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا ہے۔

ایک جھونپڑی میں چادر تان کر دو حصے کیے ہوئے ہیں۔ سامنے کی طرف دلشاد پکوڑیاں تل رہی ہے۔ پچھلی طرف زبیدہ وہی برقعہ لگائے بیٹھی ہے۔

ایک لمبا تڑنگا پٹھان پکوڑیوں کے سامنے پسکڑا مارے بیٹھا ہے۔

"گرم گرم پکوڑیاں ہیں' خان۔ کھا لو ——— بولو کتنے کی دوں؟"

"نرم ہے' خو' گرم ہے؟" پٹھان نے آنکھ ماری۔

"ہاں خان! نرم ہے' خو گرم ہے!" دلشاد کرچی منہ کے سامنے کرکے مسکرائی۔ دلشاد کی مسکراہٹ میں بھی عجیب جادو تھا۔ اس کی ایک مسکراہٹ پر نثار ہو کر رحیم خان نے قسم کھائی تھی کہ اگر سورج یا چاند یا تارے بھی اُسے اٹھالے جائیں تو وہ ارض و سما کی وسعتیں پھلانگ کر اُسے چھین لائے گا۔

پٹھان نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "خو ایک روپیہ؟"

"نہیں خان' خو پانچ روپیہ ——————"

"ہٹ' خو' ڈھائی روپیہ؟"

"خو' پانچ!"

پٹھان نے اپنی جیب کے پیسے گنے۔ اس کے پاس تین روپے چار آنے تھے اس نے پہلے دو روپیہ کا ادھار کرنا چاہا' لیکن دلشاد نے اُسے مجبور کر دیا کہ خان' قرض محبت کی قینچی ہے۔ تم پیسے پورے کر لاؤ۔ میں تمہیں جھٹ پٹ نرم نرم' گرم گرم پکوڑیاں اتار دوں گی!

پٹھان مایوس ہو کر دوسری طرف چلا گیا۔ وہاں اس نے دہی بڑوں کا سودا کیا۔ زبیدہ ابھی بچہ تھی' نادان تھی' معصوم تھی' اس لیے وہ پونے دو روپے کا ادھار

مان گئی۔

زبیدہ نے دلشاد کو آواز دی۔ "بہن ذرا اس طرف دھیان رکھنا محمود سو رہا ہے۔ میں ذرا خان کے ساتھ جا کر دہی لے آؤں۔"

اسی طرح جب دلشاد بھی اپنی پکوڑیوں کے لیے بیسن لینے کسی گاہک کے ساتھ جاتی ہے تو اپنی بچی کو زبیدہ کے سپرد کر جاتی ہے۔ دہی اور بیسن کی اس ملاوٹ پر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ملت کا مستقبل پروان چڑھ رہا ہے۔ جب دلشاد کی بچی نرم نرم' گرم گرم پکوڑیوں پر پل کر جوان ہوگی۔ جب زبیدہ کا محمود دہی بڑوں کی چاٹ پر سیانا ہوگا' تو اسلام کی برادری میں دو گرانقدر رکنوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ ایک مضبوط بھائی' ایک خوبصورت بہن —————— جسم کی مضبوطی اور جسم کی خوبصورتی! یہی تو وہ اینٹ اور گارا ہے' جس سے بہادر قومیں تعمیر ہوتی ہیں —————— جسم کی مضبوطی اور جسم کی خوبصورتی! یہی تو وہ نعمتِ عظمیٰ ہے' جو نعمتوں والے عظمتوں والے باری تعالیٰ نے تم کو عطا کی ہے۔ وہ تو بڑا ہی رحیم اور شفیق آقا ہے۔ وہی مشرق کا

یا خدا

مالک ہے، وہی مغرب کا مولا ہے۔ اُسی نے درختوں پر غنچے اور اثمار لگائے۔ وہی دریاؤں سے موتی اور مونگے نکالتا ہے۔ وہی جنّت کا رضوان ہے، وہی دوزخ کا قہّار ہے ——— پھر تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟